मेरा आंचल मैला है

میرا آنچل میلا ہے

کشمیری لال ذاکر

یہ کتاب
ہریانہ ساہتیہ اکادمی کے
جزوی مالی تعاون سے شایع ہوئی

MERA AANCHAL MELA HAI

(SHORT STORIES)

By KASHMIRI LAL ZAKIR

میرا آنچل میلا ہے

(افسانے)

کشمیری لال ذاکر

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج

نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

۲۶- سیکٹر - ۱۵- چنڈی گڑھ

پہلی بار : فروری ۱۹۸۶ء
قیمت : تیس روپے
طباعت : کلر پریس، دہلی
تعداد : چھ سو

زیر اہتمام
پریم گوپال متل

ناشر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سید مظفر حسین برنی صاحب

کی

نذر

دو لفظ

ہریانہ ساہتیہ اکادمی ریاست کے ادیبوں کی ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے کام میں مصروف ہے۔ ہریانہ کے ادیبوں کو ہندی، پنجابی، اردو اور سنسکرت میں ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات کو شائع کروانے کے لیے مالی امداد بھی دی جاتی ہے اس اسکیم کے تحت جناب کشمیری لال ذاکر کی اس کتاب 'میرا آنچل میلا ہے' کو شائع کرنے کے لیے بھی مالی امداد دی گئی ہے امید ہے کہ اردو ادب میں شغف رکھنے والے حضرات اسے پسند کریں گے۔

روپ نارائن شرما
ڈائریکٹر
ہریانہ ساہتیہ اکادمی

اِکیسویں صَدی کی بات

پچھلے کئی دِنوں سے اکیسویں صَدی کے بہت چرچے ہیں۔ پندرہ برسوں کے بعد شاید ہندوستان کے (حتّیٰ تک ایک سو کروڑ ہو جانے والے) لوگ ایک نئی دُنیا میں داخل ہو جائیں گے۔ وہ بچہ جو اس وقت پرائمری اسکول میں پڑھ رہا ہے، بی اے پاس کرتے ہی اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑا ہوگا۔ اُس دہلیز کے آگے ورلڈ بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق، دُنیا کی کُل اَن پڑھ آبادی کا ۵۴ فی صَدی حصّہ ہندوستان میں ہوگا جس میں نو سے پندرہ سال کی عمر کے کچّے نوجوان شامل ہوں گے۔ دہلیز پر کھڑا کچّی عُمر کا نوجوان، اپنے ہاتھ میں بی اے پاس کی موٹے کاغذ پر چھپی ڈگری لیے جب اپنے سامنے لگ بھگ اپنی ہی عمر کے اَن پڑھ نوجوانوں کی ایک بھیڑ دیکھے گا تو اُس کے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوگی اُس وقت۔

وہ تو پچھلے چند برسوں میں یہ سُنتا آیا تھا ریڈیو پر، دیکھتا آیا تھا
ٹیلی ویژن پر، پڑھتا آیا تھا اخباروں میں کہ سال ۲۰۰۱ میں غریبی
ختم ہو گئی ہو گی۔ اَن پڑھتا کا وجود مٹ گیا ہو گا، اچھی صحت سب
کی تقدیر میں لکھی جا چکی ہو گی۔ ماڈرن ٹیکنالوجی گاؤں گاؤں میں
پہنچ گئی ہو گی۔ یعنی کہ بیسویں صدی کا ایسا ایک ایک نشان مٹ چکا ہو گا
جس سے ہندوستان ایک پچھڑا ہوا ملک دکھائی دے۔ وہ تو اپنے
امتحان میں اکیسویں صدی کے ہندوستان پر مضمون بھی لکھ چکا ہو گا
اُن رٹے رٹائے الفاظ میں جو اُس نے سستے اور گھٹیا قسم کی
گائیڈ بکس سے یاد کیے ہوں گے ـــــــ لیکن جو کچھ اُس کے سامنے
ہوتا وہ ایک دم مختلف ہوگا۔ ایک دم بے جوڑ اور اسنگت۔ تو کیا
جو کچھ وہ سُنتا اور پڑھتا رہا تھا پچھلے چند برسوں میں، وہ سب
غلط تھا۔

نہیں غلط کچھ نہیں تھا۔
غلط کچھ بھی نہیں ہوتا

ہم صرف کئی باتوں کے غلط معنی نکال لیتے ہیں۔ زیادہ توقعات
بڑھا لیتے ہیں۔ زیادہ اُونچی اُمیدیں کرنے لگتے ہیں۔ زیادہ روشن
خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ اُن لوگوں پر زیادہ یقین کرنے لگتے ہیں جنھیں
ایسی بات کہنے پر ہم سے زیادہ دسترس حاصل ہے اور جن کے پاس
ایسی بات بڑے ہی خوبصورت ڈھنگ سے دُوسروں تک پہنچا نے کے

سادھن ہیں۔ جن کی آواز کو کئی گنا میگنیفائی کر کے مضامین بکھیرنے کے بھی ذرائع ہیں۔
کسی نے کچھ غلط نہیں کہا۔
دُوسروں نے ہی غلط اندازے لگا لیے۔ جیسے غالب کے شعروں کے غلط معنی نکالے جاتے ہیں
اکیسویں صدی کے بارے میں بھی جتنا کچھ کہا جا رہا ہے وہ غالب کے شعروں کے سمان ہے۔ آپ اپنے اپنے اٹکل لگائیے اور بھُول بھُلیوں میں بھٹکیے۔
ونسٹن چرچل نے کہیں کہا تھا

"IT IS A GOOD THING TO LOOK AHEAD, BUT UNWISE TO TRY TO LOOK FURTHER THAN YOU CAN SEE" (WINSTON CHURCHILL)

بس ہم اپنی سیماؤں کو بھُول جاتے ہیں۔ یہی ہماری غلطی ہے۔
انسان نے اپنی عملی زندگی میں اکثر اُن سیماؤں کو یاد نہیں رکھا جو اُسے گھیرے ہوئے ہیں۔ اُس نے سب سے پہلے پاؤں میں پڑی اُن سماجی، اقتصادی نفسیاتی اور اخلاقی بیڑیوں کی طرف توجہ نہیں دی جو اُسے جکڑے ہوئے ہیں۔ جب کہیں کوئی بیڑی چھنکی تو اُسے اپنی محدُودیوں کا احساس ہُوا، اور اُس نے جانا کہ وہ جس دُنیا میں سانس لے رہا ہے اُس میں بڑی جَبس ہے اور اندھیرا ہے اور سناٹا ہے اور جس دُنیا کے خواب اُس نے دیکھے

ہیں وہ بڑی حسین اور وسیع اور دل فریب ہے۔ لیکن ابھی اُس کی دسترس سے باہر ہے۔

وہ اکیسویں صدی کے خوبصورت اور کھلے آسمان میں چمکتے ستاروں کے خیال میں مگن، اس حقیقت کو بھول گیا ہے کہ وہ خود اور اُس کے ساتھ کروڑوں لوگ تو ابھی اٹھارویں صدی کی دہلیز پہ کھڑے ہیں۔

اٹھارویں صدی کی دہلیز پہ کھڑا انسان، اپنے بچے کو اکیسویں صدی کے اَن جانے سنسار میں دھکیل رہا ہے۔

اور یہ کتنا بڑا تضاد ہے۔

اسی تضاد کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔

وہ ہے اَدب، جو تخلیق ہو رہا ہے اور ادیب جس کی رچنا کر رہا ہے۔

ادیب کسی بھی زماں کا ہو۔ ادب کسی بھی زبان میں تخلیق ہو رہا ہو دونوں کے مسئلے ایک ہی ہیں۔

اَدیب کے اور اَدب کے۔

اَدب کا مطالعہ کرنا اور اَدب کی تخلیق کرنا۔

یہ دونوں کام تنہائی میں کرنے والے ہیں۔

بھیڑ میں نہ تو مطالعہ ہی ہو سکتا ہے اور نہ ساہتیہ ہی رچا جا سکتا ہے کسی بھی ماں کو ہجوم کے سامنے بچے کو جنم دینا سُوئیکار نہیں۔

ادیب اور ادب کے بارے میں سوچتے ہوئے اس سچائی کو سامنے رکھنا ہوگا

جب رات کو اپنے سرہانے کے قریب جلتی ہوئی روشنی میں، کوئی شخص

بستر میں لیٹے لیٹے کوئی کتاب پڑھ رہا ہے تو وہ ایک دم تنہا ہے۔ وہ اس وقت ایک بہت بڑے گھر میں رہتے ہوئے بھی بالکل اکیلا ہے۔ اور وہ خود ہی سکون اور ری لیکیشن اسے محسوس ہو رہی ہے وہ اس کے اس آئی سولیشن کا ہی نتیجہ ہے اور اسی کے حصول کے لیے وہ مطالعہ میں مگن ہے۔ مطالعہ اس کی پناہ گاہ ہے جس میں وہ تنہا اور ایک دم اکیلا پڑا ہے۔

یہی کیفیت ادیب کی ہے جب وہ ساہتیہ کی رچنا کر رہا ہے۔ وہ بھی اپنے گھر کے کسی کونے میں تنہا بیٹھا اُن لوگوں کے بارے میں لکھ رہا ہے جن کے درمیان وہ زندگی گزار رہا ہے اور اُن سمسیاؤں کے سمبندھ میں لکھ رہا ہے جو ان لوگوں کو ہر روز پیش آ رہی ہیں۔ ادیب بھی ہجوم اور بھیڑ کے شور شرابے میں ادب تخلیق نہیں کر سکتا مطالعہ اور تخلیق بالکل ذاتی کام ہیں جو اپنی ہی ذات میں تحلیل ہو کر تکمیل کیے جا سکتے ہیں ادب کی تخلیق اور ادب کا مطالعہ ایک عبادت ہے اور عبادت ہجوم میں نہیں ہو سکتی۔ تنہائی اور یکسوئی میں ہی ہو سکتی ہے۔ ہجوم میں تو صرف نعروں کی تخلیق ہو سکتی ہے، ادب کی نہیں۔ اور آج کا زمانہ نعروں کا زمانہ ہے۔

جتنا اُونچا نعرہ ہو گا اور جتنی اُونچی آواز میں وہ گونجے گا اُس کی اہمیت اُتنی ہی زیادہ ہو گی۔ اُتنے ہی زیادہ لوگ اُسے سنیں گے اور دہرائیں گے۔

ادب نعرہ نہیں عبادت ہے۔

ادب عبادت گاہ میں جلتے ہوئے قمقموں کی چوندھیا دینے والی روشنی نہیں روح کے اندر قدیم لو دیتی ہوئی شمع ہے اور اسی میں اس کی

ظلمت ہے۔ سانس گاہ میں جلتے ہوئے قمقمے ایک خاص میعاد کے بعد بجھا دیے
جاتے ہیں لیکن روحوں کے یہاں جانے میں جلتی ہوئی شمعیں (ندی اور لا ما لی
ہیں۔ یہ کبھی نہیں بجھتیں۔ ہمیشہ جلتی رہتی ہیں اور شکوں اور تسکین کی
ہلکی ہلکی روشنی دیتی رہتی ہیں۔ ادب کا تعلق انسان کی روح سے ہے۔ آتما
امرت ہے اس لیے ساہتیہ امر ہے۔ ادب کا تعلق کسی صدی سے نہیں۔ انسان کی
بنیادی قدروں اور ضرورتوں سے ہے۔ اس لیے وید اور آنشیدوں اور
انجیل اور گیتا اور قرآن ہر صدی کی ضرورت ہے کیوں کہ ہر صدی کے انسان کی
بنیادی ضرورتیں ایک ہی ہیں۔
اکیسویں صدی کا ادب کیسا ہوگا۔ کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے۔ اس مسئلے
پر سوچا ہے
اکیسویں صدی میں شاید آدمی کو اتنے بڑے مسئلوں سے واسطہ پڑے گا
کہ اُسے اتنی فرصت ہی نہ ہوگی کہ وہ رات کو اپنے سرہانے کی روشنی جلا کر تنہائی
میں مطالعہ کر سکے۔
اکیسویں صدی کے مسئلے اور سمسیائیں ایک دم ہی ہوں گی اور اس صدی
کی دہلیز پر کھڑا کچی عمر کا نوجوان ہاتھ میں بی اے کی ڈگری لیے بکھر جائے گا
وہ کیسے مقابلہ کرے گا اتنے گمبھیر اور بہت زیادہ مسئلوں کا؟
انسان کی سمسیاؤں کا تجزیہ تو کمپیوٹر کرے گا۔ اُس کے سادھن بھی
کمپیوٹر ہی سمجھائے گا۔ وہی اس کے لیے سوچے گا، وہی اس کی جگہ کام کرے گا
شاید اکیسویں صدی میں ادب بھی کمپیوٹر ہی تخلیق کرے گا ادیب

لوگ کتابوں کی جگہ لفظوں کی تخلیق کرنے میں لگا دیے جائیں گے۔ ادب عوام کے ہاتھ سے نکل کر سرکار کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔
پھر کتابیں کون لکھے گا؟ کہانیاں، ناول، ڈرامے کون تخلیق کرے گا۔
جو کچھ لکھا بھی جائے گا اُسے پڑھے گا کون؟ پڑھنے والوں کی فہرستیں بدل جائیں گی۔ ادب کے بارے میں اُن کے نظریے کمپیوٹر طے کرے گا۔ ماس میڈیا کی صدی ہوگی۔ آنے والی صدی۔
الفاظ کی صدی نہیں ہوگی وہ۔
سمبل کی صدی ہوگی
ایڈوانسڈ ٹیکنالوجی کی صدی ہوگی۔
تصویریں ہوں گی رنگ ہوں گے، آوازیں ہوں گی، شور ہوگا ہیر ہوگی۔
انسان ایک دوسری طرح کی جنگ میں برسرپیکار ہو جائے گا۔
جو جنگیں اُس کے آباؤ اجداد لڑتے رہے ہیں۔ یہ جنگ اُن سب سے مختلف ہوگی۔
اکیسویں صدی میں اور تو چاہے سب کچھ ہو لیکن کتاب نہیں ہوگی۔
کتاب ہوگی بھی تو اُس میں الفاظ نہیں ہوں گے۔
خالی اوراق ہوں گے جن پر آڑھی ترچھی لکیریں ہوں گی اور اُن لکیروں میں انسان کا مستقبل لکھا ہوگا۔
اور اُن کی ہلکی ہلکی سیاہی میں انسان ایک بار پھر اُس روشن صبح کی

تلاش میں کھو جائے گا جس کی تلاش میں اُس نے کئی صدیاں گزار دی ہیں۔

اکیسویں صدی بھی شاید اُسی تلاش میں گزر جائے گی!

انساں کی تقدیر میں شاید ایک مسلسل اور غیر مختتم تلاش کے علاوہ کچھ بھی نہیں!

ایک تلاش جو آدم نے شروع کی تھی۔ اور جسے جاری رکھا اُس کی اولاد کا مقدّر ہے!!

یکم جنوری ۱۹۸۶ء ـــــــ کشمیری لال ذاکر

جھیل کے پرندے

میناکشی، سُدھا اور میں بی۔ اے فائنل میں ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ میں اپنے کھدّر کے کُرتے پاجامے، اُلجھے ہوئے رُوکھے بالوں اور اپنی غزلوں کے لیے جنہیں میں ترنّم سے پڑھتا تھا، مشہور تھا اور کالج کے سبھی لڑکے لڑکیاں مجھے جانتے تھے۔ میں کالج کی کلچرل ایسوسی ایشن کا صدر چُنا گیا تھا اور سُدھا نائب صدر تھی میناکشی بہت اچھی تقریر کر سکتی تھی، اس لیے وہ ہمارے ہی ساتھ رہتی تھی کالج میں ہم تینوں اکثر ساتھ ہی دیکھے جاتے تھے ایک بار جب پرنسپل سے جھگڑا ہو جانے پر کالج میں ہڑتال ہوئی تو میناکشی اور سُدھا نے مین گیٹ پر کھڑے ہو کر کسی بھی اسٹوڈنٹ کو اندر نہ آنے دیا تھا۔

سُدھا کو میں جبھی سے جانتا ہوں۔ بہت ہی مضبوط ارادے والی لڑکی تھی وہ۔ امتحان سے پہلے پریپریٹری ہالی ڈیز کے دوران دو ایک ہی بار ملاقات ہو پائی جس دن امتحان ختم ہوئے اُسی شام میناکشی، سُدھا اور میں، ہم تینوں ایک اچھے ریستوران میں یکجا ہوئے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر ایک دُوسرے سے خط و کتابت جاری رکھنے کا وعدہ کر کے جُدا ہو گئے کچھ عرصہ کے بعد میناکشی کے خط آنے بند ہو گئے معلوم ہوا کہ اُس کا بیاہ ہو گیا

اور وہ بھوپال چلی گئی شدھا نے پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ کالج چنڈی گڑھ میں داخلہ لے لیا تھا۔ چنڈی گڑھ میں اُس سے دو بار ملاقات ہوئی ایک بار جب پنڈت نہرو چنڈی گڑھ گئے تھے اور دوسری بار جب پہلی بیور پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس ہوئی تھی، دونوں ہی بار شدھا کا زیادہ وقت میرے ہی ساتھ گزرا تھا شیخا جھیل کے کنارے کھڑے چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو پانی میں تیرتے ہوئے دیکھ کر شدھا نے پوچھا تھا۔

"اِس جھیل میں اور سری نگر کی ڈل جھیل میں کیا فرق ہے؟"

"جو فرق حقیقت اور مصنوعی پن میں ہے!"

"کیسے؟"

"اس کی وضاحت کرنا مشکل ہے!"

"لیکن اپنی بات تو صاف کرو!"

"اس جھیل کو باندھ لگا کر بنایا گیا ہے ڈل نے اپنے پھیلاؤ کو بڑھانے کے لیے باندھ توڑے ہیں!" میں نے جواب دیا تھا

"تو تم باندھ توڑنے ہی میں وشواس رکھتے ہو؟"

"نہیں باندھنے میں بھی!"

"اور اگر کوئی نہ بندھنا چاہے؟"

"تو ٹوٹ سکتا ہے!"

اشاروں میں کی جانے والی باتیں شدھا بھی سمجھ رہی تھی اور میں بھی۔ اور جب میں دو دن تک چنڈی گڑھ کی کشادہ سڑکوں پر شدھا کے ساتھ جی بھر کر گھومنے کے بعد دہلی واپس آ گیا تو شدھا نے لکھا تھا۔

"تمہارے جانے کے بعد میں نے شیخا جھیل پر جانا چھوڑ دیا ہے کبھی

موقع ملا تو تمہارے ساتھ مل کر میری بگر کی ڈل جھیل دیکھوں گی تب تک تم مادھ مادھ حاؤ۔ میرا العادن ساتھ رہے گا۔"

میں شردھا کے اس ابلیڈ کو کئی دنوں تک تیلوں کی جیب میں ڈالے گھومتا رہا جب کپڑے تبدیل کرتا تو اس مڑے تڑے ابلیڈ کو میلی تیلوں کی جیب میں سے نکال کر دھلی ہوئی تیلوں کی جیب میں ڈال لیتا

اس کے بعد میں چنڈی گڑھ گیا لو شردھا کے پیپر ہو رہے تھے۔ میں نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔ صرف ایک ہی بار اس سے ملا اور وہ بھی بہت کم وقت کے لیے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"امتحان کے بعد کہاں جا رہی ہو؟"

"گھر جاؤں گی۔"

"وہاں کیا کرو گی؟"

"کہیں سروس کر لوں گی۔"

"تم یہاں، یونیورسٹی میں جرنلزم کا ڈپلومہ کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"مجھے جرنلزم بے حد پسند ہے لیکن ڈیڈی اس پر راضی نہ ہوں گے۔"

"تم انھیں منانے کی کوشش کرو۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے تم جرنلسٹ ہو ہی تمہاری شاگردی کر لوں گی۔"

"میری شاگردی کر کے کامیاب نہ ہو سکو گی۔"

اسی لمحہ اس کی کوئی کلاس میٹ آ گئی اور بات کا رخ بدل گیا پھر وہ مجھے ہوسٹل کے گیٹ تک چھوڑنے آئی اور بولی۔

"ہم دونوں مل کر ایک اخبار نکالیں گے۔"

"لیکن میرے پاس اتنا سرمایہ کہاں ہے؟"
"اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔"

اور پھر شدھا نے بہت تپاک سے ہاتھ ملایا پھر دو ایک بار مڑ کر دیکھا اور پھر وہ ہوسٹل کے اندر چلی گئی

میں دہلی واپس آ کر اخباروں کے لیے خبریں تلاش کرنے کے لیے گلیوں اور سڑکوں اور کافی ہاؤسوں کے چکر لگانے لگا کندھے پر کیمرہ ڈالے، جیب میں نوٹ بک لیے، گھٹیا قسم کے سگرٹ پیتا اور کڑوی کسیلی کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے اپنا دماغ لٹاتا رہتا جب کسی اخبار کے کالم میں اپنی کھینچی ہوئی سٹوری چھپتی تو دل بہت خوش ہوتا اس خوشی میں شدھا کو شریک کرنے کے لیے اخباروں کی کٹنگز اسے بھیجتا رہتا

جس دن امتحان کا رزلٹ نکلا میں نے اسے مبارک کا تار دیا کچھ ہفتوں کے بعد شدھا نے اطلاع دی کہ اس نے ایک اسکول میں سروس کر لی ہے اور جب اسے پہلی تنخواہ ملی تو اس نے مجھے ویزا بھیجنے کو کہا، وہ مجھے اسٹیشن پر ریسیو کرنے آئی اور پھر بار بار اصرار کرنے پر بھی وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ جو دو دن میں نے اس کے گھر گزارے تھے ان کا لطف مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس نے میرے اعزاز میں ایک بے حد شاندار پارٹی دی اور مجھ سے اپنی غزلیں سانے کی بھی فرمائش کی شدھا کے والدین اور وہ سب لوگ جو اس پارٹی میں آئے تھے مجھ سے بے حد خوش تھے۔ دو دن کے بعد جب وہ مجھے چھوڑنے کے لیے بس اسٹینڈ پر آئی تو میری طرف ایک سنڈل بڑھاتے ہوئے اس نے کہا

"اس کے بعد جب آؤ تو یہ سوٹ پہن کر آنا تاکہ اپنی پسند کی چُن لیا میں تمہیں اپنی پسند کے لیے مجبور کرنا نہیں چاہتی"

" لیکن سوٹ کی سلائی کے پیسے کہاں سے آئیں گے؟"

" درزی کا بل مجھے بھیج دیا!" اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا اور پھر ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اُس کے سہرے بال اُس کے خوبصورت چہرے پر لہرا گئے۔ بس میلے تک وہ سڑک پر ایک سایہ دار درخت کی طرح کھڑی اپنے آنچل کی چھاؤں دُور تک پھیلاتی رہی۔

یوتھ فیسٹیول دیکھنے آئی تھی شدھا ٹھہری تو وہ کسی رشتہ دار کے ہاں تھی لیکن اُس کا سارا وقت میرے ہی ساتھ گزرتا تھا میں پریس کا پاس جیسا میں ڈالے اُسے تال کٹورہ گارڈن گھماتا رہا اور وہ ملک کے مختلف صوبوں سے آئے کلچرل ٹروپس کو دیکھ کر اور نئی نسل کے لوگوں سے مل کر خوش ہوتی رہی پھر ایک بار اُس نے میرے پرانے کھدر کے کرتے پاجامے کی طرف دیکھ کر طنزاً کہا

" جسے کھدروں میں گھسنے کی لت پڑ جائے۔ وہ مخملوں میں نہیں رہ سکتا!"

" ٹھیک ہی کہتی ہو!"

" اور نہیں تو کیا اچھا بھلا سوٹ سلوایا ہے لیکن پہنو گے پھر وہی چار آنے گز والا کھدر نا!"

میں نے اس کی بات کے جواب میں صرف فیض کا ایک شعر سنایا

یہ آج لطف کرا تا کہ کل گزر نہ سکے
وہ رات جو کہ ترے گیسوؤں کی رات نہیں

پھر شدھا پہاڑ گنج کی ایک گھٹیا سی بستی میں میرا کمرہ دیکھنے آئی کمرے میں قدم رکھتے ہوئے اُس نے تلخی سے کہا

"تو تم یہاں رہتے ہو؟"

"ہاں"

"اس ماحول میں رہ کر ایسی ہی باتیں کی جا سکتی ہیں جیسی تم کرتے ہو"

"تم نہیں جانتیں شردھا کہ یہ لوگ جو آس پاس کی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں، مجھے کتنا پیار کرتے ہیں"

"بس رہنے دو نیچی مت بگھارو۔ میں جانتی ہوں جیسے تیس مار خاں تم ہو!"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا

"پانی پلا سکتے ہو؟"

شردھا کے سوال پر میں نے ایک بار اپنے ہی کمرے کو غور سے دیکھا۔ جیسے وہ میرا کمرہ نہیں تھا کسی دوسرے شخص کا کمرہ تھا کمرے میں نہ صراحی تھی نہ گلاس

"ٹھہرو میں ابھی لاتا ہوں پانی"

"بس رہنے دو اوقات تو تمہاری ابھی ہی ہے ماجواب دیکھتے ہو شہزادیوں کے" یہ کہہ کر شردھا نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا اور مجھے اپنے قریب کر لیا مجھے محسوس ہوا کسی شہزادی نے سچ مچ ہی مجھے اپنے آنچل سے باندھ لیا ہو۔

شردھا اسی دن رات کی گاڑی سے واپس چلی گئی۔

ایک سال بیت گیا

اس دوران شردھا سے دو تین بار ملاقات ہوئی ہم آہستہ آہستہ ایسے جذبات کے بندھن باندھتے گئے جس میں پیار کا ساگر موجزن تھا

ہم ایک کھوتے پر بیچ گئے تھے اس لیے رسمی باتیں رہ ہوتی تھیں

ایک دن اچانک ہی میاکشی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ راج گھاٹ سے ہو کر آئی تھی مجھے اُس نے اپنے بھائی دیپ بیدر سے ملایا جو اندور کے میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا پھر شدھا کی باتیں ہوتی رہیں میاکشی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی پھر اُس نے کہا

" پردیپ صاحب اچلیے شدھا سے مل آئیں میں چاہتی ہوں اُسے اپنا سالا دوں"

" اُسے آپ پرائی سمجھتی ہیں اب تک؟"

" نہیں یہ بات نہیں۔ میں اُسے اپنی بھابی سالسا چاہتی ہوں"

میں میاکشی کی بات پر ہنسا۔ اُس کا یہ کہنا مجھے اچھا لگا کہ شدھا اور میں اپنے مستقبل کے بارے میں آخری فیصلہ کر چکے تھے۔ میں کیوں کہوں کچھ شدھا کے بارے میں۔ دونوں کو ساتھ لے چلتا ہوں۔ خود ہی بات کر لیں گے اُس سے۔ اگلے دن پہلی ہی بس سے جانے کا فیصلہ ہوا اُس رات میں پہاڑ گنج کی ایک گھٹیا سی بستی میں اپنے چھوٹے سے اندھیرے کمرے کے اندر لیٹے ہوئے تاج محل سانے کے خواب دیکھتا رہا دوسرے دن، دوپہر کے وقت ہم شدھا کے گھر پہنچ گئے۔ میاکشی، دیپ بیدر اور میں جب میاکشی اور شدھا گلے ملیں تو تینوں برس پہلے کے زمانے نظروں میں گھوم گئے

رات ہم بہت دیر تک جاگتے رہے

شدھا میری ہی باتیں کرتی رہی مجھے میری بے پروائی پر ڈانٹتی رہی پھر اُس نے مجھ سے میری غزلیں سنیں پھر بات کچھ ہوا دیپ بیدر تو جیسے دیوانہ ہو رہا تھا اُس نے کئی بار میاکشی کے کان میں کہا کہ وہ شدھا کی ماں سے بات کرے

لیکن بیناکشی جیسے سب کچھ جان گئی تھی اور اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب شردھا کے بارے میں اُس کی ماں سے بات نہ کرے گی۔ سونے سے پہلے بیناکشی شردھا سے بولی۔

" کبھی بھدریال آؤ۔ بہت اچھی جگہ ہے "

" اور راُس سے بھی اچھی جگہ ہے" ویریندر بولا

" بھدریال آنا ہوا تو اور ضرور آؤں گی" شردھا نے مسکرا کر جواب دیا۔

" آپ بھی آیئے گا پردیپ صاحب! آپ آئیں گے تو ایک مشاعرہ کا بھی اہتمام کریں گے "

" مشاعرے کے لیے تو اسے کل ہی لے جاؤ" شردھا نے کہا اور میں جواب میں ہنس دیا۔ بولا کچھ نہیں۔

اور پھر رات نے اپنی موٹی چادر تاں کر سب کو خاموش کر دیا۔ سب سو گئے میں سونے کی کوشش میں آدھی رات تک جاگتا رہا اور میرے خیالوں میں وہ مانند سدھتے رہے جن کے اندر ڈل کی لہروں میں جھومتے ہوئے کنول لہلہا رہے تھے اور جن کے کناروں پر جھیل کے تیکھی ایسے رنگ برنگی سکھ پھیلائے تازہ دھوپ کا لطف لے رہے تھے۔

اگلی صبح ہمیں پہلی بس سے دہلی جانا تھا ہم جلدی ہی تیار ہو کر بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑے۔ بیناکشی شردھا، ویریندر، شردھا کی ممی اور میں، فاصلہ زیادہ نہیں تھا ہم پیدل ہی چل رہے تھے۔ ویریندر بیناکشی کے ساتھ چل رہا تھا اور بہت ہی مدھم آواز میں اُس سے کچھ کہہ رہا تھا۔

" ویریندر بھیّا تمہارے کان میں کیا کہہ رہے ہیں" شردھا نے تو خی سے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں"
میناکشی کا جواب سُن کر ویریندر سٹپٹا سا گیا۔
"تم نے بہت دنوں سے مجھے ایک بھی کلنگ نہیں بھیجی۔ اب کی بار ضرور بھیجنا!"
شُدھا مجھ سے مخاطب ہوئی۔
"ایک ساتھ کئی کٹنگز بھیجوں گا کل ہی!"
"بھیج چکیے"
شُدھا نے اپنی بھرپور نظریں میرے چہرے پر جماتے ہوئے کہا اور پھر مُسکرا دی۔ اُجلی دھوپ میں اُس کی کھلی ہوئی مسکراہٹ بہت پیاری لگ رہی تھی۔
بس اسٹینڈ پہنچ کر میں ٹکٹ لینے کے لیے بکنگ ونڈو کی طرف چلا گیا۔ شُدھا اپنی ممی سے باتیں کرنے لگی اور ویریندر میناکشی سے۔
"نہیں رہنے دو" میناکشی ویریندر سے کہہ رہی تھی۔
"کیا بات ہے میناکشی" شُدھا کی ممی نے پوچھا۔
"نہیں، کچھ نہیں آنٹی جی!"
"وہ کچھ کہنا چاہتا ہے اور تم اسے روک رہی ہو۔ کہو بیٹا، کیا بات ہے"
یہ سُن کر ویریندر کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اُسی لمحہ میناکشی نے میری طرف دیکھا جیسے میری مدد چاہتی ہو۔
"ہاں بات کہہ لو۔ کیا حرج ہے" میں نے بھرپور دلچسپی سے کہا۔ بیچ کر کہ میناکشی جب اتنی دور سے آئی ہے تو بات صاف ہو جانی چاہیے غلط فہمی کیوں رہے۔
میناکشی شُدھا کی ممی کو ایک طرف لے جا کر بات کرنے لگی اور شُدھا

اور ہم آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے

"آپ کبھی کھائیں پیر دیپ صاحب!" میناکشی نے مجھے مخاطب کیا میں دونوں کے قریب چلا گیا

"آپ آنٹی جی، ابھی سے پوچھ لیں دیپ یندر کے بارے میں" میناکشی لولی

"اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے"

"شردھا اور میں بہت پرانی دوست ہیں میں اُسے اپنی بھابی ساکرہمیشہ کے لیے اپنے پاس لے جانا چاہتی ہوں" میناکشی کہہ رہی تھی

"لیکن تم نے دیر کردی بیٹی امیں تو شردھا کی بات پکی کرچکی ہوں"

میناکشی نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں بہت بڑا مجرم ہوں

"کہاں کی بات آپ نے؟" میناکشی نے پوچھا میں نے پلٹ کر دیکھا سریدر شردھا کے قریب ہوکر اُس سے کچھ کہہ رہا تھا، اور پھر میں نے شردھا کی ممی کی آواز سنی۔

"لڑکا انجینئر ہے ابھی ابھی امریکہ سے آیا ہے" لہجہ بہت صاف اور درد بی تھا۔

اور مجھے یوں محسوس ہوا میں نے اب تک جو دیکھے مادھ سائے تھے وہ سب یل بھر میں ڈھہ گئے اور ڈول کا اتھاہ پانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا اور پھر میں نے دیکھا ایک اونچی چوٹی پر شردھا کھڑی تھی اور بچے ہوئے مادھ کی کنکھری مٹی کو اپنے پاؤں سے کرید کرتیز رفتار سے بہتے ہوئے پانی میں پھینکے جارہی تھی۔ اسی لمحہ سن کے گنڈ کرتے پسل دی اور میں نے ایک آخری نظر شردھا پر ڈالی شردھا کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں

یا کتی، دیریندر اور ریں بس میں بیٹھ گئے لیکن سدھا کی جھکی ہوئی پلکیں پھر
اوپر نہ اٹھیں۔
اُس کی آنکھوں کی شفاف جھیلوں میں تیرتے ہوئے پرندے پھڑپھڑا رہے
تھے۔ نہ جانے کس نے نیلے کھلے آکاش سے نکھری دھوپ میں اُن پر بجلی
گرادی تھی

اُپاسنا

وہ بھی ایک دوپہر تھی!

میں ایک دن کے لئے تمہارا مہمان تھا۔ کئی بار تمہارا مہمان ہونے کی عزت مجھے حاصل ہوئی۔ تم بہت اچھی میزبان ہو۔ مہمانوں کی خدمت کرتی ہو، اپنی دلچسپ باتوں سے ان کا جی بہلاتی ہو۔ انہیں صبح سویرے بستر سے اٹھنے پر مجبور نہیں کرتیں مجھے وہ میزبان ذرا بھی پسند نہیں جو مہمان کو رات دیر تک بیٹھے رہنے سے روکے، جماہیوں پر جماہیاں لے اور پو پھٹتے ہی جگا دے۔ تم نہ جلد سو جانے کو کہتی ہو نہ صبح سویرے جاگنے کو۔ تمہیں خود بھی تو آدھی رات تک جاگنا اور صبح ۹ بجے تک سونا پسند ہے۔ تمہاری ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ تم چائے بہت اچھی بناتی ہو۔ نہ جانے کس کس چائے کی پتی کو بلینڈ کرتی ہو۔ اچھی چائے مجھے بہت ہی کم گھروں میں ملی ہے یہی چند گنتی کے گھر۔ لیکن وہاں صرف چائے ہی تھی اور کچھ نہ تھا اور تمہارے گھر میں اس کے علاوہ بھی تو بہت کچھ تھا۔ تم تھیں، تمہاری باتیں تھیں، تمہارا خلوص تھا تمہارا انتظار تھا جو مجھے ہاتھ پکڑ کر وہاں کھینچ لے جایا

کرتا تھا۔ تمہارے ہاں پہنچ کر میں ہمیشہ اپنی گھڑی تمہارے حوالے کر دیا کرتا تھا اور اس طرح وقت کے احساس کو میں مکمل طور پر ختم کر دیتا۔ تم کہتیں۔ چائے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا تھا صبح کے نو بجے ہیں۔ تم نہانے کو کہتیں تو مجھے معلوم ہوتا کہ دوپہر ہو گئی تھی اور میں صبح سے آلسیوں کی طرح پلنگ توڑ رہا تھا۔ تم کہتیں شام کی چائے تیار ہے تو میں جان جاتا کہ پانچ بجنے والے ہیں۔ یوں کہہ لو کہ اپنی گھڑی تمہیں سونپ کر میں ایک دن کے لئے اپنی زندگی تمہیں سونپ دیا کرتا تھا۔ اسے تمہارے حوالے کر دیتا تھا اور تم اسے سارا دن حفاظت اور پیار سے رکھتی تھیں اور واپسی کے وقت جب تم میری گھڑی میں خود ہی چابی دے کر مجھے لوٹاتیں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے تم نے میری زندگی میں نیا احساس، نیا ولولہ اور نیا ارادہ بھر کر میری امانت مجھے واپس کی ہے۔ زندگی کی جدوجہد میں پوری تندہی سے حصّہ لوں، لڑوں، زخم کھاؤں اور جب تھک جاؤں تو ایک دن کے لئے پھر تمہارے پاس لوٹ آؤں۔

میرے پہنچنے پر تم میرے اٹیچی کیس کو اپنے کمرے میں رکھ لیتی تھیں اور میری ضرورت کے مطابق اُس میں سے میرے استعمال کی چیزیں نکال کر دیتی رہتی تھیں۔ لیکن جب مجھے لوٹنا ہوتا تھا تو ساری چیزیں یا مجھے خود ہی سنبھالنا پڑتی تھیں بہت پریشانی ہوتی تھی کئی کمروں میں بکھری چیزوں کو اکٹھی کرتے ہوئے۔ تم ایک طرف الگ کھڑی سے یہ ساری تیاری تکتی رہتیں۔ جیسے اس ساری پریشانی سے تمہارا کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ میں پریشان ہوتا رہتا اور تم مسکراتی رہتیں۔ تمہیں ہاتھ بٹانے کو کہتا تو تم اور دور ہو جاتیں تم نے ایک بار بھی میری واپسی پر میرا سامان سنبھالنے میں دلچسپی نہ لی۔

میں سمجھتا تھا اس کی وجہ، تمہیں میرے سوا اگت میں خوشی ہوتی تھی، رخصت کرنا تمہیں پسند نہ تھا۔ تم ہر صبح نئی چاہ سے میرا سواگت کر سکتی تھیں لیکن عمر میں ایک بار بھی رخصت کرنا تمہیں گوارا نہ تھا اور میں یہ سب مانتا تھا۔ اِس لئے اِس بات کی طرف کبھی اشارہ نہیں کیا تھا۔ اور کبھی جلدی میں اپنی کوئی چیز وہاں چھوڑ آتا تھا، کبھی غلطی سے تمہاری کوئی چیز اپنی کیس میں ڈال لاتا تھا لیکن نہ مجھے ہی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ میرا وہاں کچھ رہ گیا تھا اور نہ تمہی نے کبھی سوچا تھا کہ میں تمہارا کچھ لے آیا ہوں۔ وہ انسانوں کی زندگیاں کبھی اِس طرح بھی ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتی ہیں کہ دونوں کا الگ الگ کوئی روپ نہیں رہتا اگر کوئی رہ بھی جاتا ہے تو اُس میں کوئی کوشش باقی نہیں رہتی۔ دو زندگیوں کے اس امتزاج سے جو ایک نئی تصویر تخلیق ہوتی ہے، جو ایک نئی شخصیت اُبھرتی ہے اس میں کتنا حُسن، کتنا وقار، کتنا استحکام ہوتا ہے!

میں تمہارے گھر سے صبح کے وقت کبھی روانہ نہ ہوا۔ سدا رات ہی کو تم سے جُدا ہوا ہوں اور ان میں سے بھی بیشتر حصہ اُن راتوں کا ہے جب پورا چاند آکاش میں چمکتا ہوتا تھا۔

"بھلا ایسی راتوں میں بھی کوئی کسی سے جدا ہوتا ہے" تم کہا کرتی تھیں۔

"جُدا ہونے کا لطف ہی ایسی راتوں میں ہے جب کائنات کا ذرہ ذرہ ایک دوسرے کی قربت سے مخمور ہو کسی کو اتنی فرصت نہ ہو کہ وہ دوسروں کو جدا ہوتے دیکھے اور انہیں شرمسار کرے۔"

معاف کیا لطف ہے آپ تو ہمیشہ اُلٹی باتیں کرتے ہیں۔ پورنیما ہی کی رات کو جاتا ہوتا ہے تو مت آیا کیجئے" اور یہ الفاظ کہتے ہوئے تمہاری گہری آنکھوں میں چاندنی کی لہریں اُبھرنے لگتیں اور آواز میں کپکپی بھر جاتی۔

"اچھا، اگلی بار اماوس کو آؤں گا" اور تم ایک بار چھلکتی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر جما کر خاموش ہو جاتیں۔

ہم دونوں گیٹ پر کھڑے ہوتے، تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہوتا۔ تمہارا سر ایک لمحہ کے لئے میرے کندھے پر ٹک جاتا۔

"خدا حافظ!" اور تم پل بھر کے لئے جھک جاتیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا عہد مغلیہ کی کوئی شہزادی اپنے مرمریں محل میں کھڑی کسی اجنبی شہزادے کی راہوں میں کلیاں بکھار رہی ہو!

لمحہ بھر میں سپنا ٹوٹ جاتا۔ میں گیٹ سے باہر سڑک پر چلنے لگتا۔ رات کے سناٹے میں میرے قدموں کی آواز گونجتی جیسے تمہارے دل کی دھڑکنیں اپنے میں جذب کر لیتیں۔ کچھ قدم چل کر میں اچکی کیس سڑک پر رکھ کر ٹرس جاتا۔ گیٹ کی سلاخوں کے ساتھ لگی تم مجھے دیکھتی ہوتیں۔ میں چند لمحوں کے لئے وہیں کھڑا رہتا۔ چاندنی کے اُس عظیم سیلاب میں ہم دونوں دو تودوں کی طرح نظر آتے جو دور کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں اور انتظار کر رہے ہوں کہ کسی لہر کا جوار نہیں بہا لے جائے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے تم کہہ رہی ہو "اور انتظار کر رہے ہو ں۔

"واپس آ جاؤ صبح چلے جانا، چاندنی رات کی بات مان لو" اور میں فوراً سڑک سے اٹیچی کیس اُٹھا کر تیز تیز ڈگ بھرنے لگتا۔ میں تو بس ایک ہی

رات کے لئے آیا تھا۔ صبح پر تو میرا کوئی اختیار نہیں۔ وہ تو اُنکی ہے جن کے لئے میں سارا دن جان مارتا ہوں اور جن کے طفیل ہی زندہ ہوں۔ میں تو کشمکشِ حیات کے اس زندان سے صرف رات ہی کو فرار ہو سکتا ہوں۔ جس دن صبح کو کھانے کو یا زندگی اپنی چوکھٹ سے باہر کر دے گی اور فاقوں کا جمِ غفیر مجھے اپنی آغوش میں لے لے گا۔ لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں۔ ابھی تو میں صرف رات ہی کو آ سکتا ہوں۔ تیز چلتے ہوئے میں پلٹ کر دیکھتا۔ تم ابھی تک گیٹ کے سہارے کھڑی تھیں اور مجھے محسوس ہوتا کہ فضا نے تمام تر چاندنی کو چوس لیا ہے۔ کائنات پر گھنا اندھیرا چھانے لگا ہے۔ پورنیما کی رات ڈھل گئی تھی، اماوس اُبھر رہی تھی پورنیما میں اماوس!

تم تو پورنیما کی رات میں مجھے رخصت کرتے ہوئے کچھ محسوس کرتی تھیں حالانکہ وہ جدائی کچھ دنوں کی ہوتی تھی۔ اس میں اگلی ملاقات کے رنگ جھلکتے تھے۔ آہ تمہیں دُکھ محسوس نہیں ہوا ہے جب تم نے مجھے سدا کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اپنی زندگی کی دہلیز سے باہر دھکیل دیا ہے۔ پیار کی آخری چوٹی پر کھڑا کر کے مجھے عمیق غار میں گرا دیا ہے، جہاں سینکڑوں اماوس کی راتیں ایک دوسرے کو نگل رہی ہیں۔ یقین نہیں آتا تم نے ایسا کیا ہو۔ دل نہیں مانتا اِس بات کو جتنا میں تمہیں جانتا ہوں اتنا شاید تم کبھی اپنے آپ کو نہیں جانتیں۔ لیکن تمہارا یہ روپ کیوں نہ دیکھ سکا؟ یہ مجھے کیوں نہ احساس ہوا کہ جس ہاتھ کو تم اس پیار سے پکڑ سکتی ہو اسی پہ ایک دن ہتھوڑے کی ضرب لگا سکتی ہو؟ کیا اس لمحہ تمہارے

نڈھال ہوں درد نے میرے سارے جسم کو آہنی شکنجے میں کس رکھا ہے
اس وقت میری آنکھوں کے سامنے موت کے خدا کے تصور سے چاہئیں
لیکن نہیں اس وقت بھی تمہاری ہی صورت میری آنکھوں کے
سامنے ہے۔ وہی پیاری پیاری آنکھیں، وہی تھرتھراتے ہوئے
ہونٹ، وہی چھوٹے چھوٹے سفید دانت، ماتھے پہ جھولتی
ہوئی ریشمی بالوں کی وہی لٹ۔ میرے سامنے تم ہو اور میری
جیب میں تمہارا خط ہے جو کل شام کی ڈاک سے ملا تھا۔ وہ خط
ایک بڑے سے الاؤ کی طرح میرے سینے کو جھلس رہا ہے اور اسکی
سطروں کی شعلوں کی طرح میرے دل و دماغ کو جلا رہی ہیں۔
تم نے چار سطروں کا ایک خط لکھ کر زندگی کی اتنی طویل کہانی
کو ایک دم ختم کر ڈالا ہے۔ اتنے طویل سفر کا انجام یہ کبھی ہو سکتا
تھا؟ تم مجھے ایک لفظ کہہ کر اپنی تمام وابستگیوں اور سارے
تعلقات کو یوں بھی توڑ سکو گی؟ کاش! میں نے کبھی یہ سوچا ہوتا!
تم سے مجھے اتنے بڑے مذاق کی توقع نہ تھی! تمہارے اس
بھرپور وار نے مجھے موت سے کتنا قریب کر دیا ہے۔ کتنا قریب!
لیکن میں یہ کیا سوچنے لگا ہوں۔ موت ابھی دور ہے۔ وہ
اتنی جلدی کہاں آئے گی۔ اُن کے پاس وہ مہلت نہیں ہے جو مجھ تک پہنچتی
ہے جو اُس کے انتظار میں بے قرار ہوں۔ میں کیوں اُس کے
متعلق سوچنے میں وقت ضائع کروں کیوں نہ تمہارے ہی بارے
میں سوچوں۔ تمہاری ہی باتیں کروں، تمہارے ساتھ گذرے
ہوئے لمحوں کا دھیان کروں۔ میں مر گیا تو ان کا دھیان کیسے آئے گا۔

ہوسکتا ہے تمہیں کبھی آئے۔ لیکن اُس وقت تم ان سب باتوں کو
سوچنا ہی نہ چاہو گی۔ ایک وفادار ہندوستانی بیوی کبھی ایسا نہیں
کرسکتی ہے۔ وہ نہ تو اپنے ماضی سے بغاوت کرسکتی ہے نہ اس کے
سماج کو اپنی زندگی پہ اثر انداز ہونے کی توفیق رکھتی ہے۔ وہ زندگی
میں ہر رات اُس مرد کے لئے مر سکتی ہے جس کے ہاتھ سماج نے
اُسے سونپا ہے۔ لیکن ایک بار ہی مر جانا اُسے قبول نہیں۔ اس سے
اُس کے ماتھے پہ حرف آ جاتا ہے۔ اس سے اُس کا خاندانی وقار مجروح
ہوتا ہے۔ وہ مرد کو تو ٹھکرا سکتی ہے لیکن کانٹے بھری راہوں پر
گھسیٹے جانے پہ اُف نہیں کرتی۔ شاباش!

لیکن میں تو اُس دوپہر کی بات کر رہا تھا۔ اپریل کے آغاز کی وہ دوپہریں کتنی
ہاں کتنی حسین تھیں وہ دوپہریں۔ حرارت اور خنکی کا ہلکا ہلکا امتزاج بہت ہی خوبصورت
پیاری ہوتی تھیں۔ حرارت اور خنکی کا ہلکا ہلکا امتزاج بہت ہی خوبصورت
معلوم ہوتا ہے۔ میں پلنگ پہ لیٹا تھا اور تم میرے پاس بیٹھی تھیں۔
میں تمہاری چند چوٹیوں میں گندھے ہوئے بالوں کو کھولنے میں لگا تھا
اور تم مجھے وہ کتابیں دکھا رہی تھیں جو تم نے دو تین مہینوں میں
پڑھی تھیں۔ مجھے یہ بالوں کو انگلیوں کے گرد لپیٹنے کی عادت ہے۔ کیا
میرے اس کھیلنے پر صرف وہ چڑ دیتی ہے۔ لیکن تم کبھی نہ چڑتی تھیں۔ بس مسکرا دیتی تھیں۔
تمہاری یہ ہلکی سی مسکان آج بھی میرے
ذہن میں محفوظ ہے۔ شاید اسی کی روشنی میرے ارد گرد پھیلی
ہے اور اسی کی ضو سے میں موت کے اس گھنے اندھیرے میں بھی
اپنا راستہ صاف طور پہ دیکھ رہا ہوں۔ تم مجھے کتابوں سے بھی

اچھی اچھی سطریں سنوار رہی تھیں جن کے نیچے تم نے سرخ پنسل سے
نشان لگا رکھے تھے۔ میں سوچ رہا تھا، اُن کی تعریف بھی کر رہا تھا
اور بیچ بیچ میں تمہارے چہرے پر کبھی نگاہ ڈال لیتا تھا۔ جس جس
کسی اچھی سطر کو پڑھتے وقت گلال سے گال اکھلتے تھے۔ شاید
اسی لئے مجھے گلاب کے پھول پسند ہیں۔ ہلکی ہلکی سرخی والے
تازہ تازہ پھول!

"کیا سنگھار کھل رہا ہے!" میں نے ایک بار ہنس کر کہہ دیا اور
تمہارے چہرے پر جیسے ایک دم گلابوں کے ڈھیر لگ گئے۔

"ہٹئے" اور تم نے میرے اچھے خاصے سلجھے ہوئے بالوں کو
بُری طرح بکھرا دیا اور میں نے تمہارا ہاتھ پکڑ لیا اور میرے ہونٹ
اُس میں اُبھری ہوئی ان نیلی نیلی رگوں پر جم گئے۔ کتنی پیاری تھیں وہ
نیلی نیلی رگیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوتا تھا کہ راستے
سڑکوں سے کہیں زیادہ حسین ہوتے ہیں۔ میں کتنی ہی دیر ہاتھ کی پشت
پر پھیلی ہوئی ان نیلی نیلی پگڈنڈیوں میں کھویا رہا اور اُس وقت احساس
ہوا جب منزل نے خود ہی مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" تم نے مجھ پہ جھکتے ہوئے پوچھا۔
مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے تمہاری آنکھوں میں چھلکتی ہوئی ساری شراب
مجھ پہ برس پڑے گی!

"سوچ رہا ہوں، کیا منزل میرا ساتھ دے سکے گی؟"
"منزل تو آپ کے پاؤں چوم کر اپنا وجود ہی کھو چکی ہے۔ اب
کہاں جا سکتی ہے وہ!" تم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے

اپنے اوپر جھکتے ہوئے تمہارے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔
"کسی اور راہی کی تلاش میں!" میں نے جواب دیا اور اپنی آنکھیں تمہاری مدبھری آنکھوں میں ڈال دیں۔ میرے ان الفاظ نے ان لبالب بھرے پیالوں میں اتھل پتھل پیدا کر دی۔ پلکوں کا کنارہ وہ چھلک پڑے۔
"ایسا کبھی نہ ہوگا!" تم نے اپنی برستی ہوئی آنکھوں کو میرے سینے پر ٹکا دیا۔ تمہارا جسم شدت سے لرز رہا تھا۔ تم سسکے جا رہی تھیں۔
"مجھے شک ہے:
"آپ میرے وشواس کا اپمان کر رہے ہیں۔"
اس سمے دوپہر کو تمہیں اپنے سینے سے لگاتے میں نے تمہارے وشواس کا اپمان کیا تھا، یا صرف تمہیں تمہارے ماحول کی مجبوریوں کا احساس دلانے کا خیال کیا تھا، اس بات کا فیصلہ کون کر سکتا ہے۔ لیکن تم نے شاید اسے اپمان ہی سمجھا تھا۔ جبھی تو۔ جبھی تو ــــــ اچھا کچھ نہیں۔ میں نے غلط سوچا ہے۔ تم نے مجھ سے اپمان کا بدلہ نہیں لیا۔ ہو سکتا ہے سزا دی ہو لیکن میرا جرم اتنا سنگین تو نہیں تھا جس کا اتنی شدت کی سزا دی جاتی۔ سزا پر چند کر تختہ ڈی دی جاتی ہے وہ تمہیں دے دی جاتی ہے۔ کاش بیسویں صدی کے اس مہذب دور کا مجرموں کو کبھی اپنے بارے میں کچھ کہنے کا حق ہو، سزا چننے کی سہولت سکے!
وہ دوپہر بیت گئی۔ آنسوؤں سے کھیلتی ہوئی وہ دوپہر اب کبھی لوٹ کر نہ آئے گی۔ میرے لئے تو کبھی نہ آئے گی۔ تمہیں شاید

جاں آگئی ہے جیسے میری لاش کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو جانے کی میرے
سلگتے ہوئے نڈھال اور ادھ مرے جسم میں تمہاری یاد پھر لوٹ رہی
ہے جیسے سرما کی ٹھٹھری، ٹھری اور بھیگی رات کے سینے پر کسی
کنواری صبح کا پہلا اجالا اتر رہا تھا

کنواری صبح!

میرے ذہن میں وہ ایک صبح ابھر رہی ہے۔ ٹھہرو میں ذرا
اُسے ہی ابھر کر دیکھ لوں!

اُس رات ہم دیر میں سوئے تھے۔ تمہیں اپنے راستے
کے سفر کی تفصیلات سناتا رہا اور ان پر تمہاری تنقید سنتا
رہا تھا اور اس طرح دو بج گئے تھے۔ تم صبح مجھ سے پہلے جاگ
اٹھیں۔ ہاں اُس وقت شاید کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ تم میرے
کمرے میں آئیں اور مترنم آواز میں قتیل شفائی کا یہ شعر گنگنانے
لگیں ے

وصل کی رات نہ جانے کیوں اصرار تھا اُن کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ نغمہ بھی میرے خواب کا
کوئی حصہ تھا۔ خواب بھی انسان کی زندگی کے لئے کتنے ضروری
ہیں۔ اتنے ہی ضروری جتنے کہ سورج اور چاند، دھرتی اور آکاش،
ہوا اور پانی، پھول اور پتے۔ بلکہ ان سب سے بھی زیادہ اہم اور
زیادہ تاثر انگیز! سورج اور چاند اندھیرے میں غرق بھی ہو جائیں
تو بھی ہمارے خواب ان کی تخلیق کر سکتے ہیں۔ دھرتی اور

آکاش فنا ہو جائیں تو بھی ہمارے سپنے انہیں دوبارہ تراش سکتے ہیں۔ کیسول اور فنے مر جائیں تو ہمارے خواب اُن سے کہیں سندر اور مدھر پھول کھلا سکتے ہیں، نغمے بکھیر سکتے ہیں لیکن .

... لیکن جب خواب ہی مر جائیں تو کائنات کی ہر شے فنا ہو جاتی ہے زندگی کی آخری دھڑکن بند ہو جاتی ہے۔ انسان کی عظمت کا آخری نشان مٹ جاتا ہے۔ تم وہ شعر گنگنائے جا رہی تھیں۔ اور میرے ذہن میں صبح کی بہوئی کرنوں کی پائلیں کھنک رہی تھیں۔ تم میرے سرہانے بیٹھ کر میرے بالوں کو سہلانے لگیں۔ میری پیشانی پر تمہاری پتلی پتلی انگلیاں ہولے ہولے حرکت کر رہی تھیں۔ تمہارے آنچل کا ایک چھور میرے گال کو مس کر رہا تھا۔ تمہارے ہونٹ دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔ میں نیم وا آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ میں جنگل میں ایک جھرنے کے کنارے لیٹا ہوں اور کوئی پہاڑی شہزادی میرے بالوں میں جنگلی پھول ٹانک رہی ہے۔ اس کی ہلکی ہلکی خوشبو میری سانس میں رچ رہی تھی میرے ماتھے پر چاندنی نرم نرم لہریں حرکت کر رہی تھیں اور میرے گالوں پر شبنم سے بھیگی ایک شگوفہ ڈالی اپنا خنک سایہ ڈال رہی تھی اور شہزادی پیار کا کوئی گیت گا رہی تھی کوئی ایسا گیت جو برسات اور چوٹیوں سے نکل کر مرغزاروں میں حل ہو جاتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے وادیوں کے گہرے سناٹے میں رچ کر سننے والوں کی پلکوں میں رس بن کر سما جاتا ہے۔

میں نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ تم مسکرائیں، جیسے صبح کا

سنہرا اُجالا کسی تھکے ہوئے شکستہ پا مسافر کو چُوم رہا ہو۔ اس کے
زخموں پہ پھائے رکھ رہا ہو۔ اُسے منزل کی آس دلا رہا ہو۔
میرا خواب ٹوٹ گیا۔ لیکن حقیقت اُس سے کہیں زیادہ حسین
تھی بعض حقیقتیں اتنی پیاری ہوتی ہیں کہ اُن پر خواب ہونے کا
گمان ہونے لگتا ہے۔

تم نے پل بھر کو اپنے گال میرے گالوں پر رکھ دیئے اور پھر
سہارا دے کر اُٹھایا۔

"آیئے آپ کو اپنا باغیچہ دکھاؤں؟" تم میرا ہاتھ تھامے
مجھے باہر لے جا رہی تھیں۔ تم مجھ سے ایک قدم آگے تھیں جیسے
راستہ دکھا رہی ہو۔

یہ تمہاری ہی کوٹھی تھی۔ اُس میں پہلی بار آیا تھا۔ کل جب
آیا تھا تو شام ہو چکی تھی۔ کچھ بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ اب تم مجھے
اپنا گھر دکھا رہی تھیں۔

تمہارا چھوٹا سا باغیچہ مجھے بہت اچھا معلوم ہوا۔ تمہارے
مالی نے اُس پر یقیناً بہت محنت کی تھی۔ سبز سبز گھاس پہ
شبنم کے قطرے چمکتے ہوئے بہت ہی بھلے معلوم ہو رہے
تھے۔ تم نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے جیسے اپنا
پاؤں اس شبنم بھری گھاس پر رکھنے کے لئے اُٹھایا تو میں نے
تمہیں کھینچ لیا۔

"کیوں؟" تم سراپا استفسار بن گئیں۔ تمہارے ماتھے
پہ چند ایک شکنیں ابھر آئیں۔ تمہاری پلکیں اُٹھ گئیں جیسے قیامت کا

کوئی لمحہ اچانک ایک جگہ رک گیا ہو۔ شبنم سے لدی اس گھاس پر چپل لے جانا پاپ ہے۔ پاس ان رنگینیوں کا دل ٹوٹ جائے گا"
"ٹھیک ہے۔" تم نے بہت مختصر جواب دیا۔ قیامت گزر گئی تھی۔

ہم دونوں نے چپل اتار دیئے اور گھاس پر پاؤں رکھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی شبنم کے لمس سے مجھے عجیب سے سکون کا احساس ہونے لگا تھا۔ تم نے میرا ہاتھ کیسے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور ہم شاد شاد اس خواب آلود گھاس پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ کچھ قدم چلنے کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک گھاس تو کیسے اور سلیقے سے اٹھتے ہوئے ہمارے پاؤں شبنم سے گیلی گھاس پر اپنے نشان چھوڑ آئے تھے۔

"کتنے پیارے معلوم ہو رہے ہیں یہ نقش پا۔"

"بہت ہی پیارے" تم نے میرا ہاتھ ایک دم دبوچ سا لیا اور تمہارے گالوں پر گلاب کھل اٹھے۔

"سفر کرتے ہوئے اپنے پیچھے مڑ کر دیکھنے سے ایک عجیب سا لطف محسوس ہوتا ہے پاس۔ کبھی حیرت ہوتی ہے کہ اتنا کٹھن سفر ہم کیسے طے کر آئے ہیں۔ کبھی خوشی ہوتی ہے کہ مشکل راستہ کٹ گیا، اب سفر آسان ہے۔ ہمارا ماضی لغزش اور نجاست ہمیں بے حد سہارا دیتا ہے۔"

"ہم حیوان میں اس وقت ناکام ہوتے ہیں جب ہم ماضی کو بالکل بھلا کر فردا میں کھو جاتے ہیں جب ہمیں اپنے طے کئے

ہوئے سفر کا احساس ہی نہیں رہتا۔"
یہ کہتے ہوئے تم اپنے قدموں کے نقوش کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"ہم تو اپنے ماضی کو نہیں چھوڑ سکتے نا!"

"نہیں لیکن آپ رُک کیوں گئے! ماضی میں کھو کر تو آگے چلنا اور بھول جانا چاہیئے" ہماری بات سن کر میں مسکرا دیا تم آگے چلنا چاہتی تھیں۔ تمہاری انگلیاں ابھی تک میرا ہاتھ تھامے ہاتھ میں تھا تمہارے قدموں میں مصروفیت تھی۔ تمہیں منزل کی چاہ تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت حوصلہ ہوا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے غلط ساتھی نہیں چنا تھا۔

باغیچے کا ایک چکر لگا چکنے کے بعد تم مجھے پھولوں کے پودے دکھا رہی تھیں۔ سبھی قسم کے پھول تھے۔ شبنم میں نہائے ہوئے شگفتہ غنچے، ادھ کھلے پھول اور نسترن کی ملائم کلیاں کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔ گلاب کے گہرے سرخ رنگ کے پھول مجھے خاص طور پر اچھے معلوم ہو رہے تھے۔ ایسے پھول میں نے کشمیر کے باغوں میں دیکھے تھے۔ انہیں تمہارے باغیچے میں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

میرا ہاتھ تھامے تم مجھے گلاب کے ایک پودے کے پاس لے گئیں۔

"اس پودے میں یہ پہلا پھول کھلا ہے۔" اس چھوٹے سے پودے میں پتیوں میں سے جھانکتا ہوا وہ سرخ پھول واقعی حسین معلوم ہو رہا تھا۔

"پہلا پھول؟" میرے ہونٹوں سے نہ جانے کیوں ایک آہ نکل گئی۔ اچھا ہوا تم نے دیکھا نہ تھا۔ ورنہ تم ضرور ناراض ہوتیں۔

" بہت دنوں سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دعا مانگتی تھی جب یہ کلی کھلے گی ان دنوں آپ ضرور یہاں ہوں۔"

"کس لئے؟"

" میرے اس سوال پر تم نے اپنی گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ جب تمہاری آنکھوں میں سارے مانجھے کی شبنم جذب ہو کر رہ گئی تھی۔

" اسے دیوتا کے قدموں میں چڑھانے کے لئے" تم نے جواب دیا۔

" لیکن اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ دیوتا کون ہے اور پجاری کون؟"

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

" میرا نام اتنا حسین جواب تھا۔ جی چاہا کہ آگے بڑھ کر پیار سے تمہارا ہاتھ چوم لوں۔ لیکن ڈر تھا کہ تمہارے ہونٹوں پر ان گنت پھول کھل اٹھے تو انہیں کون سنبھالے گا۔

" آپ یا میں"

" جی"

" دیوتا اور پجاری کیا نام سے پہچانے جاتے ہیں؟"

" نہیں۔"

" تو یہ پھول میں چڑھاؤں گا۔ تمہارے قدموں میں۔"

"کیوں؟"

"پوجا تو ہیں کی تابوں تمہاری" میں نے تمہارے پاؤں کی طرف دیکھا گورے گورے پاؤں شبنم میں بھیگ کر کتنے پیارے معلوم ہو رہے تھے۔ اس پر کھلا ہوا گلاب کا پھول بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتا۔ میں سوچ رہا تھا۔

"اور دیوتا بھی سمجھتی ہوں آپ کو؟"

"دیوتا اور پجاری میں بہت فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ہی دیوتا ہیں اور دونوں ہی پجاری بھی۔"

"تو پھر مجھے بھی اپنی آشا پوری کرنے دیں۔"

"نہیں، ٹاس کر لو، جو جیت جائے پھول اس کا۔"

تم ہنس دیں۔ میری جیب میں ایک میلا سا پیسہ پڑا تھا۔ شاید سفر میں کسی سگریٹ والے نے ریزگاری میں دیا تھا۔ میں نے اسے اچھالا۔ تم جیت گئیں۔ میں جانتا تھا تم جیت جاؤ گی تم ہار جاتیں تو مجھے ذرا بھی خوشی نہ ہوتی۔ تمہیں اپنی جیت کا سدا ہی وشواس رہا ہے اور اس وشواس نے مجھے بہت سی مشکل گھڑیوں میں سہارا دیا ہے۔ وشواس تمہارا تھا، سہارا مجھے ملتا رہا ہے ایک دوسرے کی شخصیت پر کتنا ہمارا حق تھا ہم دونوں کو تم نے بہت شروع ہی سے پھول کو پودے سے توڑا۔ یہ اس پودے کا پہلا پھول تھا۔ تمہارے باغیچے کی یہ اس کی پہلی کھیپ تھی۔ تم کتنی خوش تھیں۔ تم نے وہ پھول میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اس کی پنکھڑیوں کو چوم لیا۔ تم نے نظریں جھکا لیں۔

اور تمہارے کانوں کی لویں جگمگا اٹھیں۔

"دیپتا نے پسیٹا قبول کر لی؟" جذبات کی شدّت سے تمہاری آواز کتنی دلکش معلوم ہو رہی تھی۔

"ہاں۔"

"شکریہ!"

"شو کرو جانے پر یہ پھول بے کار نہیں ہو جاتے اُپاستا؟"

"نہیں، ان کی قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے!"

"کیسے؟"

"یہ اندر چل کر بتاؤں گی۔"

کچھ دیر کے بعد جب ہم کمرے میں آئے تھے تو تم نے مجھے وہ سب پھول، کلیاں اور پنکھڑیاں دکھائی تھیں جو میں نے کبھی تمہیں پیش کئے تھے۔ وہ سب تم نے ہاتھی دانت کے ننھے چھوٹے سے بکس میں محفوظ کر رکھے تھے۔ ان میں وہ پھول بھی شامل تھے جو میں نے تمہاری سالگرہ پر اس بار تمہیں بھیجے تھے۔ اور جنہیں پا کر تم نے لکھا تھا کہ وہ پھول تمہارے لئے روشنی کے مینار تھے جو تمہیں ہمیشہ راستہ دکھاتے رہیں گے روشنی کی اہمیت کا ——— احساس دلاتے رہیں گے اور گہنا رکھنے نہ دیں گے اور منزل پر پہنچا کر ہی دم لیں گے۔ تم نے اپنی سالگرہ کے دن اُن مہکتے ہوئے پھولوں کو اپنے بالوں میں ٹانک کر ایک عزم پیہم اور طاقت کا احساس کیا تھا۔

میں دیر تک تمہارے اُس گلاب کے پھول کو اپنے ہونٹوں پر

گھُماتا رہا، گالوں پر پھیرتا رہا اور میری نظریں شبنم پر جمے اُن نقوش
پہ ٹکی تھیں جنہیں تمہارے پاؤں نے سرسبز گھاس پہ ابھارا تھا۔
میں نے ایک دم پھول کی ایک ایک پنکھڑی الگ کر دی اور تمہارے پاؤں کے نشان پر ایک ایک پنکھڑی
رکھنے لگا جیسے دیوالی کی رات اپنے گھر میں کوئی چراغ جلا رہا ہو۔ اپنے در و دیوار اُجال
رہا ہو۔ تم حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" تم نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"اِس گلاب کی سرخی کو امر کر رہا ہوں!"

میری بات سنتے ہی تم نے آگے بڑھ کر مجھے روک لیا اور
میں نے سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے باقی پنکھڑیاں تمہارے
کھنچے ہوئے پاؤں پر رکھ دیں۔ کچھ نیچے گر پڑیں۔ وہ ایک شبنم
کی نمی سے تمہارے پاؤں پہ جم گئیں۔ تم نے انہیں اٹھا لیا۔

"کبھی کبھی آپ بالکل بچے بن جاتے ہیں!"

"جھڑکیاں کھانے کو جی چاہتا ہے نا، اس لئے۔"

تم مسکرا دیں اور میں بھی مسکرا دیا اور پھر ہم دونوں باغیچے
سے باہر نکل آئے۔ کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے میں نے
ایک بار پھر گھاس پر چمکتے ہوئے تمہارے پاؤں کے نقوش
کو دیکھا۔ ان پر بکھری ہوئی سرخ سرخ پنکھڑیاں دور سے بہت
اچھی لگ رہی تھیں۔ میرے دل و دماغ میں تمہارے پیار کے
چراغ جل رہے تھے اور میرے کانوں میں تمہارے قہقہے گونج
رہے تھے۔

تمہارے قہقہوں کی نقرئی گھنٹیاں میرے کانوں میں اس وقت

بھی گونج رہی ہیں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ میری زندگی کے کارواں کی گھنٹیاں ہیں اور میری زندگی کا کارواں خلائی راہوں پر دھیرے دھیرے رواں ہے۔ شکستہ پا۔ نڈھال اور مضمحل شام کے سائے طویل ہوتے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر ہی میں دادیاں تاریک ہو جائیں گے۔ ستاروں کی شمعیں جل اٹھیں گی۔ چاند کا الاؤ دہکنے لگے گا اور میرے یہ تھکے ہارے رخم الاؤ کی اس حرارت سے راحت اور تسکین محسوس کرتے ہوئے دکھنا بند کر دیں گے۔ کارواں کی گھنٹیوں کی آواز مدھم ہو جائے گی، میرے ذہن پر نیند کی سی کیفیت طاری ہونے لگے گی۔ میری آنکھیں نیم وا ہو جائیں گی اور پھر مسکراہٹیں لٹاتی ہوئی فراخ دل شب سفید چادر سے میرا جسم ڈھانپ دے گی۔

اور پھر گہری تاریک اور خاموش رات ایک دم منجمد ہو کر رہ جائے گی اور میری منزل کا آخری سنگ میل مجھے اپنے سینے سے لگا لے گا۔

چھوٹا سا غم

میں جب کبھی اُس سے ملتی ہوں تو وہ میرے دماغ میں ایک کونفلکٹ پیدا کر دیتا ہے ہر ملاقات کے بعد یہ فیصلہ کرتی ہوں کہ اب اِس سے نہیں ملوں گی لیکن اگلی بار جب ملتی ہوں تو جذبات میں وہی شدت اور دل میں وہی چاہ ہوتی ہے۔ ہر بار وہ کوئی تیکھی سی بات کہہ دیتا ہے اور میں ہر بار کڑھتی ہوئی اُس سے الگ ہوتی ہوں

پچھلے اتوار کو وہ میرے ساتھ تھا کہنے لگا چلو کافی ہاؤس چلتے ہیں مجھے کافی اچھی نہیں لگتی لیکن وہ ساتھ ہوتا ہے تو میری اپنی کوئی پسند رہتی ہی نہیں اپنی شخصیت پر جیسے میرے سارے حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔ میز پر بیٹھے تو وہ اُدھر سرے والی میز پر بیٹھی لڑکی کو ایک ٹک دیکھنے لگا مجھے اُس کی یہ حرکت بے حد ناگوار گزر رہی تھی میں نے میز پر پڑے اُس کے ہاتھ کو دبایا تو وہ مسکرا دیا

"اُس لڑکی کو دیکھ رہا تھا اُس کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں!"

اُس کی بات سُن کر میں جل ہی تو گئی۔

"تمہیں تو دراصل بالکل نہیں اپنے آپ سے!!"

"حسن میری کمزوری ہے اور تم اعتماد میرا شعار"
میری سمجھ میں اس کی بات خاک بھی نہ آئی وہ اسی طرح کی کوئی نہ کوئی
پہیلی ڈال دیتا ہے اور میں خاموش ہو جاتی ہوں
کڑوی کافی کا ایک گھونٹ پیا تو اور بھی کڑوی لگی مس میں بڑا اکیلا پن
بھر گیا تھا
اس سے کچھ روز پہلے کی بات ہے وہ مجھے جھیل کے کنارے گھما رہا تھا اور
چنڈی گڑھ کی جھیل تو حامی خوبصورت جیز ہے سیلانی اور لوگ بھی گھوم
رہے تھے وہ خاموشی سے سگرٹ پھونکے جا رہا تھا اور جھیل کے گدلے پانی کو یوں تک
رہا تھا جو پہاڑوں پر ہونے والی تازہ بارش کے کارن نالوں سے بہہ کر
جھیل میں جمع ہو گیا تھا میں ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور پانی کی سطح کو چھو کر
آتی ہوئی خنک ہوا کا لطف اٹھا رہی تھی۔ جانے اسے کیا ہوا کہ اس نے اپنی رفتار
تیز کر دی میں نے بھی تیز تیز قدم اٹھا نا شروع کئے لیکن وہ چند ہی لمحوں میں
مجھ سے آگے نکل گیا میں نے پکارا بھی لیکن وہ لوبے پیاری سے چلا جا رہا تھا میں
ہار کر جھیل کے کنارے کی پتھر سے بنی ہوئی دیوار پر بیٹھ گئی کچھ دور جانے کے بعد
شاید اسے محسوس ہوا کہ میں ساتھ نہیں بھی موڑ اپلٹا اس کی نظریں بڑی بے
چینی سے ہر چہرے کو ٹٹول رہی تھیں اور اس اجنبی ہوئی نگاہ میں کوئی بھی چہرہ نہ
ٹک رہا تھا یہاں تک کہ وہ میرے قریب سے گزر گیا اور مجھے دیکھا تک نہیں میں
اس بے پیاری پر تڑپ ہی تو اٹھی
" سنو! میں شردوں کی بجائے اسے سنو کہہ کر پکارتی ہوں یہ مجھے اچھا لگتا
ہے"
کچھ قدم آگے بڑھ کر وہ رک گیا اور پھر مجھے غصے سے گھورتا ہوا مڑا۔

غصہ آگیا

"بڑی بدتمیز لڑکی ہو تم"

"میں؟"

"ہاں تم، تم، تم!"

جی میں آیا کہ ایک زناٹے دار تھپڑ لگاؤں اس کے منہ پر

"مجھے چھوڑ کر آگے نکل گئے انتہا ہے بدتمیزی کی!"

"تو لو میں اور بدتمیزی کرتا ہوں"

اور یہ کہکر وہ جہاں میں کھڑی تھی مجھے چھوڑ کر چل دیا اور اپنا اسکوٹر سٹارٹ کر کے چلتا بنا میں روہانسی ہو گئی اور آٹو رکشا میں بیٹھ کر اکیلی گھر آئی اس رات میں نے یہ پکا ارادہ کر لیا کہ اب اس کا منہ تک نہ دیکھوں گی کچھ روز اس سے ملی تک نہیں

میں یونیورسٹی کیمپس کے بک اسٹال پر کھڑی تھی اور نئی آئی ہوئی کتابیں دیکھ رہی تھی اچانک کسی نے میرے ہاتھ سے ہیرلڈ رابنز کی تازہ کتاب وہ [illegible] کھینچ لی

"کتابیں پڑھنے کا سلیقہ سیکھو"

میں گھبرا کر پیچھے مڑی

وہ کتاب ہاتھ میں لئے مسکرا رہا تھا

"تم میں تو ذرہ برابر بھی شرافت نہیں" میں نے تلخی سے کہا

"میں نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا!"

"آئی ڈونٹ وانٹ ٹو سی یو اگین!!"

"بٹ آئی وانٹ"

مجھے یقین تھا کہ میرے تم سے یہاں آنے کو کہا ہے تو تم ضرور آؤ گی انکار نہیں کرو گی تم آجاؤ گی تو ہم تمام رات جاگ کر وقت کی راکھ کو کریدتی رہیں گی اور کسی ادھ بجھی چنگاری کی چمک سے اپنی رنگ رلیاں یاد کرتی رہیں گی

خط کو بیچ میں ہی چھوڑ کر کمرے سے باہر آگئی۔ ادھورا خط لکھ کر طبیعت سنبھل گئی تھی۔ یوں ہی کسی گیت کا بول گنگناتی ہوئی صحن میں نکل آئی آسمان پہلے کی نسبت زیادہ صاف لگ رہا تھا کال بیل گونجی، دروازہ کھولا تو تار والا کھڑا تھا۔ تار کا لفافہ کھولتی ہوئی اندر آئی تو ماں نے پوچھا کس کا تار تھا۔

"وسیم اور شکتی کا" میں نے جواب دیا۔

تار آجائے تو ماں کا کمزور دل دھڑک اٹھتا ہے۔ تار کسی اچھی خبر کے لئے بھی دیا جا سکتا ہے اس کا ماں کو بہت ہی کم تجربہ ہے جب کبھی تار آیا کوئی نہ کوئی بری خبر ہی ملی۔

"دونوں کا ایک ساتھ؟"

"ہاں، آج رات آرہے ہیں۔"

ماں کا چہرہ ایک دم تازہ ہو گیا، جو تار کا نام سنتے ہی بے حال ہو کر رہ گیا تھا

"گاڑی سے آرہے ہیں کیا؟"

"رات کو گاڑی تو کوئی آتی نہیں سامد کار سے آئیں"

وسیم اور شکتی دونوں بھائی ہیں دونوں کی عمر میں ایک برس کا فرق ہے وسیم بڑا ہے اور شکتی چھوٹا ایک انجینیرنگ کر چکا ہے دوسرا میڈیکل کے فائنل میں ہے دونوں رشتے میں میرے کزن ہیں پتا جی کے مرنے کے بعد چچا اور ماں جس خاندان سے وابستہ رہیں، وہ یہی خاندان تھا، اس سمے یہ دونوں بھائی سکول میں پڑھتے تھے۔

نہیں تھا دل جل گیا پانچ سات منٹ میوزیم کے سامنے والے میدان میں گھومتی رہی لیکن اس کی پرچھائیں تک نظر نہ آئی اس کا سکوٹر بھی تو وہاں نہیں تھا سوچا میوزیم کے اندر چلوں اور اوپر آرٹ گیلری میں چکر لگاؤں بے حد تھکے قدم اٹھاتے اوپر گئی اور گیلری میں گھومنے لگی ہر کاریگر ایک اچٹتی ہوئی سی نظر ڈالتی، کوئی اکا دکا دیکھ کسی تصویر کے سامنے کھڑا نظر آتا ایک بار جو گھوم کر دیکھا تو سوہلی آرٹ والے کارنر میں ایک پینٹنگ کے سامنے ترن کھڑا تھا اور کچھ لکھ رہا تھا ادھر بڑھی، قدموں کی آواز سن کر اس نے پیٹھ گھمائی

"ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں اب تو"

"میں منٹ سے پریشان ہو رہی ہوں تمہیں ڈھونڈنے میں یہاں چوروں کی طرح کھڑے ہو"

"انتظار کرنا میرے بس کی بات نہیں"

"سب باتیں دوسروں ہی کے بس کی ہیں تمہارے بس کا تو کچھ بھی نہیں"

"یہ آرٹ گیلری ہے، کلاس روم نہیں۔ خاموش رہو"

بڑی کراہیں لے وہ کاغذ جس پر وہ نوٹس لے رہا تھا، اپنے بریف کیس میں رکھ دیا اور بڑی ہی سرپھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر اپنے نرم ہاتھ سے میرا ہاتھ دبا دیا اور مجھے اپنے ساتھ لئے مخصوص پینٹنگ کے سامنے سے گزرتا ہوا شیش محل کی ایک پینٹنگ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"یہ شخص زندگی کی کرختگی کا شکار ہے دراصل ہم میں سے ہر آدمی زندگی کے جبر کا شکار ہے کمزور آدمی جبر کے مضبوط ہاتھوں میں گھٹ کر پس جاتے ہیں اور سمجھدار لوگ زندگی کی پہیلی پر مسکرا دیتے ہیں!"

ملن اس کے ساتھ دھیرے دھیرے چل رہی تھی اور خاموش تھی

"اور تم کہتی ہو کہ میں جب بھی تم سے ملتا ہوں تمہارے ذہن میں کوئی نئی کونفلکٹ پیدا کر دیتا ہوں۔ ہر آدمی کو اپنی کون فلکٹس کا حل خود ہی ڈھونڈنا پڑتا ہے تم بھی ڈھونڈو"

اور پھر وہ اچانک ہی تیز تیز قدم اٹھاتا پیچھے جانے کو مڑ گیا میں نے اُسے روکنا چاہا لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا وہ ایک بار پھر مجھ پر بھرپور وار کر گیا تھا میں اتنی بڑی وسیع آرٹ گیلری میں اکیلی کھڑی تھی اور دیواروں کے ساتھ لگے رنگوں میں سے جھانکتے ہوئے چہرے اور کونوں میں رکھے مجسمے خاموش لگا ہوں اور گنگ زبانوں سے میری مظلومیت اور بے کسی پر طنز کر رہے تھے۔

وہ بغیر کسی اگلی ملاقات کا وعدہ کئے چلا گیا اور میں اُس سے اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ جے اور نشی آ رہے تھے اِس لئے میں کچھ روز اُس سے نہیں مل سکوں گی گھر لوٹ کر یوں بستر پر گری جیسے میری تمام شخصیت ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی تھی اور کوئی بھی کرچی شیشہ کی نہیں جو ہاں کر سکتی تھی اپنی ٹوٹی ہوئی شخصیت کے ٹکڑوں کو سنبھالتے ہوئے میں نے کاٹ دیا تمام دن۔

رات کو گیارہ بجے جب میں بستر پر پڑی جل رہی تھی اور شیرن کی کہی ہوئی باتوں کے بارے میں سوچ رہی تھی، کار کا ہارن ہوا اور پھر جے اور نشی اندر آ گئے اور اُن دونوں نے باری باری مجھے چپٹا لیا جیسے ہم جسم سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ دونوں نے ماں کے پاؤں چھوئے اور ماں نے گھر کے سب لوگوں کی خیریت پوچھی پھر انہوں نے ہاتھ منہ دھویا اور کھانے کی میز پر بیٹھ گئے میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا لیکن بھوک بھی نہ تھی بھوک تو جیسے مر گئی تھی جے اور نشی کے ساتھ بیٹھنا پڑا اور کچھ نہ کچھ کھانا بھی پڑا۔

جانے کب تک میں جاگتی رہی اور پھر سوتے اور جاگنے کی حدود پھر پڑی

رہی۔ جہاں دماغ جو کچھ بھی سوچتا ہے، اُس پر جوابوں کا دُھندلکا ہوتا ہے اور آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں اُن پر غبار کا باریک پردہ ہوتا ہے۔

یہ دونوں بھائی کتنے اچھے تھے۔ ان کے ساتھ میرے بچپن کا ایک زمانہ گزرا تھا۔ ان کے ماں باپ ہم سب کو کتنا چاہتے تھے۔ وشے کتنی صاف اور سیدھی باتیں کرتا تھا۔ اُس کے خاکوں میں کتنا "بیلنس تھا"۔ لکیروں میں ملی میٹر کے سوویں حصے کا بھی فرق نہیں تھا۔ ہر چیز ایک دم جچی تلی۔ ایک طرف شیریں حسن کے خاکوں میں کہیں توازن نہیں تھا۔ ہر بات ایک دم ایبسٹریکٹ آرٹ جسے نہ آرٹسٹ سمجھ سکے نہ دیکھنے والا۔ ان ہی سیلینیسٹس اور ان کی بیلینسڈ خاکوں کے خطوط اپنے پوروں میں دبائے میں سوگئی اور تمام رات محسوس ہوتا رہا کہ خطوط کے تیز دھارے میری ہتھیلیوں میں چبھتے رہے تھے۔

وشے اور شکتی چار روز یہاں رہ کر آج چلے گئے ہیں۔ ان تمام دنوں میں ماں بہت خوش رہی ہے۔ اُس نے چنڈی گڑھ کے تمام سیکٹر اور آس پاس کی ساری جگہیں دیکھ لی ہیں اور جی بھر کر اکھوائے کھایا ہے۔ اکھوائے میں نے بھی کھایا ہے لیکن میرا ذہن صاف نہیں تھا کسی نہ کسی کونے میں فلکسٹڈ کی پرچھائیں ہر دم میرے ساتھ رہی ہے۔ شکتی اپنی ماں کا ایک خاص پیغام اور ایک سندھی کڑھا ہوا لایا تھا۔ جو اُس نے آتے ہی میری ماں کو دے دیا تھا۔ ماں نے وشے کو اور مجھے کئی بار اکیلے گھومنے کو بھیجا ہے اور ہم نے بہت سے مسئلوں پر باتیں بھی کی ہیں شادی کے مسئلے پر بھی بات ہوتی تھی۔

"شادی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں نے کبھی سوچا ہی نہیں اس کے متعلق۔"
"میں شاید اگلے چھ ماہ میں امریکہ چلا جاؤں۔"
"ضرور جائیے اور اگر ہو سکے تو واپس نہ آئیے۔"
"کیوں؟"
"یہ سب تو ایک دم جیل خانہ ہے!"
"فرار کیوں نہیں ہو جاتیں اس قید خانے سے؟"
"فرار اس کا حل نہیں ہے۔"
"تو کیا ہے اس کا حل؟"
"میں یہ بھی نہیں جانتی۔"
میں نے ورجے کے کسی سوال پر کوئی کومینٹ نہیں کیا۔ جو سادھارن سا جواب سوجھا دے دیا۔
ایک رات ماں نے سونے سے پہلے کہا۔
"ورجے کیسا لگا ہے بیٹی تمہیں؟"
"بہت اچھا ہے۔ بڑی میرے دوار باتیں کرتا ہے۔"
"اس کی ماں نے مجھے اس کے لئے مانگا ہے۔"
میں خاموش رہی۔
"شادی کے بعد ورجے امریکہ جانا چاہتا ہے۔"
میں چپ رہی۔
"تم اس کے ساتھ خوش رہو گی۔"
میں نے کچھ نہیں کہا۔
"تو کیا جواب دوں بیٹی ورجے کی ماں کو؟"

"اتنی جلدی میں کچھ نہیں کہہ سکتی" یہ کہہ کر میں نے کروٹ لے لی۔

"لیکن وہ تو ایک آدھ روز میں واپس چلے جائیں گے۔"

"تو چلے جائیں۔"

اس کے بعد ماں نے کچھ نہ کہا۔ اُس نے بتی بجھا دی۔ میں پہلو بدلے پڑی رہی اور آنکھیں بند کیے محسوس کرتی رہی کہ ماں رو رہی تھی۔ وہ کب تک روتی رہی اور میں کب تک جاگتی رہی۔ اس کا مجھے اندازہ نہ ہو سکا۔

مقتا میں ان چار روز میں گھومی ہوں اُتنا شاید پچھلے چار برس میں نہیں گھومی۔ جہاں بھی جاتی یہی ڈر رہتا کہیں شرما نہ مل جائے اور اس ڈر نے مجھے ہر لمحہ گھیرے رکھا۔ میں جھیل پر اور میوزیم میں اور اُن ریستورانوں میں جان بوجھ کر نہیں گئی جہاں شرما جایا کرتا ہے اور ابھی ابھی وجے اور شکتی اپنی نئی گاڑی میں چنڈی گڑھ سے گئے ہیں۔ ابھی ابھی گیٹ کے باہر کھڑے ہو کر اُن دونوں نے ماں کے پاؤں چھوئے ہیں اور شکتی نے مجھے چمٹایا ہے اور وجے نے بڑے ہی مہذب طریقے سے آداب کیا ہے اور پھر دونوں گاڑی اس اسٹریٹ کے گھماؤ سے مدھیہ مارگ کی طرف مڑ گئے ہیں اور میں اور ماں دونوں اندر آگئی ہیں۔ ماں ایکدم خاموش ہے۔ اور اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی ہے۔ اُسے اُس کے کمرے میں چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں آگئی ہوں۔ میری حالت اس کمزور درخت کی سی ہے جو متواتر کئی روز ایک تیز اور تُند سیلاب کی زد میں رہ کر اپنی جھکی ہوئی شاخیں سنبھال رہا ہو۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے انگ انگ سے مدافعت کی
قوت چھن گئی ہے اور میری تمام شخصیت میں جھول پڑ گئے ہیں۔
مجھے ذرا بھی ہمت نہیں رہی۔ اس ادھورے خط کو بھی بڑی
مشکل سے مکمل کر رہی ہوں۔

بس اب تم فوراً آجاؤ۔ تم نے دیر کر دی تو میں ٹوٹ جاؤں گی
میری نازک جاں اتنا بھاری بوجھ برداشت نہ کر سکے گی۔ تم آؤ گی
تو میرا بوجھ ہلکا ہوگا۔ میری مشکل آسان ہوگی۔

د بجے تے آکر میرے ذہن میں ایک اور کونفلکٹ پیدا کر دی
ہے۔ میرے چھوٹے چھوٹے غموں میں ایک نئے غم کا اضافہ کر دیا ہے۔
میرا ذہن بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ تم آؤ گی تو کوئی حل نکلے گا۔
ایک طرف وہ ہے جس کے ساتھ میرا بچپن گزرا ہے، جس کے خاندان
کا میرے خاندان پر بڑا احسان ہے۔ ایک ایسا آدمی جس کے ہاتھ
میرا مستقبل سونپنے سے ماں مطمئن ہو سکتی ہے ایک ایسا شخص جیسے
جا کے بڑی ترتیب سے سجے ہیں۔ کسی لکیر میں کوئی ترچھا پن نہیں
جس کے پاس صاف ستھرے، سیدھے راستے ہیں۔ جن پر کوئی
بھی شخص اس یقین سے چل سکتا ہے کہ وہ منزل پر پہنچ جائے گا
اور دوسری طرف شرن ہے جس کی کوئی بات صاف نہیں، ہر
بات الجھی الجھی ہے۔ جو مجھے خواب دے سکتا ہے اور ان میں
زندگی کے زخموں سے نکلے ہوئے خون سے رنگ بھر سکتا ہے
اور حقیقت کی کڑواہٹ دے سکتا ہے اور پیار کی مٹھاس
دے سکتا ہے۔ جس سے میرا ساتھ بہت پرانا نہیں لیکن جیسے ہم

ایک دوسرے کو کئی جنموں سے جانتے ہیں۔ جس کا میرے خاندان
پر کوئی احسان نہیں۔ لیکن میری شخصیت پر ضرور ہے۔ ایک
کے پاس کسی اجنبی دیش کی خوبصورت زندگی اور اُس کی دلچسپیاں
کے ارمان ہیں اور دوسرے کے پاس اپنے مُلک کی دھرتی اور
اس کی مٹی کی سوندھی خوشبو ہے۔ مجھے دونوں ہی تصویریں پسند
ہیں۔ لیکن کھینچی تو آخر ایک ہی تصویر ہے۔ دونوں تو نہیں کھینچ سکتی
اس گھڑی میں اپنے آپ کو نہایت بےکس اور مجبور پا رہی ہوں۔ تم
آؤ اور وہ تصویر کھینچ دو جو میرے مستقبل کے چوکھٹے میں فٹ
آ سکتی ہے۔

تمہارے آنے تک میں ستیش سے کبھی نہیں ملوں گی اور دمے
کی ماں کے خط کا جواب لکھا نہیں جائے گا۔ میں اب کسی اور
کو فلکشا کا مقابلہ نہیں کر سکتی!!

پگھلتی ہوئی سرد رات

مجھی جب نچلے برتھ پر میرا بستر رکھ چکا تو میں نے کمپارٹمنٹ کا
جائزہ لینے کی غرض سے اپنے آس پاس نگاہ ڈالی۔ گاڑی چلنے میں ابھی
ایک گھنٹہ باقی تھا لیکن بہت سے مسافروں نے اپنے بستر بچھا لئے
تھے۔ تین چار عورتوں کے علاوہ کمپارٹمنٹ میں سبھی مرد تھے۔ میرا
برتھ ریزرو نہیں تھا۔ اس لئے میرا ہولڈال ۲۷ نمبر کی سیٹ پر پڑا تھا
ساتھ کی سیٹ خالی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گئی۔ پرس میں سے رومال
نکالا اور غیر ارادی طور پر اپنا ماتھا پونچھنے لگی۔ جیسے اس پر گرد جم
رہی ہو۔ اور جب کہ حقیقت یہ تھی کہ گرد بالکل نہیں جمی تھی میں ایڈیٹ
حضرت گنج سے دو ایک چیزیں خریدتی ہوئی، چار بجے پلیٹ فارم پر
آ گئی تھی اور کوئی اتنا لمبا سفر طے نہیں کیا تھا کہ چہرے پر گرد و غبار
جم گیا ہو۔ رومال اپنے ہاتھ میں مسلتے ہوئے میں نے پرس میں ڈال دیا
یہ نہ جانے کیا عادت ہے میری۔ رومال کو ہاتھوں میں ملتی رہتی ہوں
جب تک وہ ایک چھوٹا سا گولا نہیں بن جاتا۔ جیسے کوئی نہیں سا کاغذ
ہو۔ چکن کے رومال سراسر مسلنے پر کیا بن جاتے ہیں، یہ میں نے کبھی

فصلوں کا بُرا حال تھا اور ملک کے کئی حصّوں میں قحط کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے سامنے کے دروازے سے ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا اور میرے سارے جسم میں کپکپی سی پھیل گئی۔ اُسی جھونکے سے سامنے والے مرتبان سے سگرٹ کی راکھ اُڑی اور اس کے ذرّے میرے چہرے سے آٹکرائے۔ مجھے بے حد غصّہ آیا لیکن اُس آدمی کو ذرا بھی احساس نہ تھا۔ کیا واہیات آدمی ہے میں نے دل میں سوچا اور پرس میں سے رُومال نکال کر کپڑے کی ایک گولی سی اپنے چہرے پر پھیرلی۔

گاڑی جب لکھنؤ کے خوبصورت ریلوے اسٹیشن سے گزری تو میں نے شام کے بعد پہلی بار سوچا کہ اب میں دہلی کیوں جا رہی تھی؟ کوئی مقصد ہی نہیں رہ گیا تھا جاے کا رومی کا تار مل جانے کے بعد دہلی جانا بالکل بے کار تھا۔ مجھے تو اُس کے ساتھ شیو ایرز ایو (Shivaji Express) میں جانا تھا اور اب اُس نے تار سے اطلاع دی تھی کہ وہ کسی ضروری کام سے آگرہ جا رہی ہے۔ اِس لئے میں دہلی نہ آؤں۔ میں جانتی تھی کہ وہ کسی دوست کے ساتھ پروگرام بنا چکی ہوگی۔ ہو سکتا ہے آگرہ ہی جا رہی ہو یا کہیں دہلی ہی میں رنگ رلیاں منانے کا پروگرام ہو۔ بہر حال وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اُس سے ملنے جاؤں اور میں پھر بھی جا رہی تھی۔ مجھے اُس کی اس نازیبا حرکت پر بے حد غصّہ آیا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ میں اِس طرح بے مقصد ہی دہلی چلی پڑوں۔ جیسے اِس بھرے شہر میں میرا کوئی اپنا نہیں جس کے ساتھ میں اس سال کا آخری دن اور آخری رات

گذار سکوں۔ وہ سال جس نے مجھے چھوٹے بڑے غموں کے ساتھ کچھ خوشیاں بھی دی تھیں۔ کیوں نہ میں اُس کے دریچے ہوئے غموں کو بھول کر اُن چھوٹی چھوٹی مسرتوں کو یاد کروں جو گذرتے ہوئے لمحوں نے میری جھولی میں ڈالے ہیں۔ کیوں نہ میں حضرت گنج میں گھوم کر، بلیئرڈ کے ریلوں میں اپنے آپ کو کھو دوں۔ کیوں نہ گومتی کے کنارے کسی خاموش مقام پر بیٹھ کر اپنی یادوں کا جائزہ لوں اور سوچوں کہ آنے والے سال میں مجھے کیا کرنا ہے۔ اور نہیں تو اپنی نرس ساتھیوں کے ساتھ اپنی ناموش فطرت کو بدل کر، ایک رات سارے غم اور سارے پچھتاوے بھلادوں اور نہیں تو نجمہ کا اُس کے تازہ صدمے میں ساتھ دوں اور اسے سمجھاؤں کہ اشرف نے جو کچھ کیا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ بہت سے اشرف اس سے پہلے بھی ایسا کر چکے ہیں اور عورت نے کبھی سرلا، کبھی نکہت، کبھی شکیلا، کبھی نجمہ بن کر یہ سب کچھ برداشت کیا ہے۔ عورت مرد کی نسبت کہیں زیادہ وسیع القلب ہے۔ اسی لئے وہ تخلیق کر سکتی ہے۔ لیکن یہ سب باتیں میں اب سوچنے لگی تھی جب گاڑی حرکت میں آچکی تھی اور مسافر اپنی جگہوں پر بیٹھنے لگے تھے اور کسی مسافر نے کمپارٹمنٹ کا سامنے کا دروازہ اندر سے بند کر کے بولٹ کر دیا تھا۔ اب سوچنا بے کار تھا۔

سامنے والے برتھ پر لیٹا مسافر کمپارٹمنٹ کی چھت پر نظریں گاڑے سگریٹ پھونکے جا رہا تھا اور اُس نے برتھ کے

پیچھے آدھے باہر سر کے ہوئے اٹیچی کیس کے ایک کونے میں اٹکے کارڈ کو دیکھا۔ لکھا تھا — "وسیحے" مجھے یہ نام اچھا لگا۔ اس نام کا تعلق مہابھارت سے تھا، ایسا میں نے اپنی ہندو سہیلیوں سے سُنا تھا۔ ایک بار جب میں نے اُس کی طرف دھیان سے دیکھا تو وہ اپنے کھُلے ماتھے پر بکھرے ہوئے رُوکھے بالوں کو پیچھے ہٹا رہا تھا۔

"آپ یہ سیٹ بھی استعمال کر لیجئے۔ اور تو کوئی مسافر آیا نہیں۔" میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بغل والی سیٹ پر بیٹھا بیوپاری مسافر مجھ سے مخاطب تھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا اور اُس نے اپنا ہولڈال سیٹ نمبر ۴۸ کی طرف سرکا لیا۔

"شکریہ!" میں نے کہا۔

اور اس نے ۴۸ اور ۵۷ نمبر کی سیٹ پر اپنا ہولڈال پھیلا دیا اور بہت شرافت سے سنبھل کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ بےچارے نے اپنے پاؤں بھی پوری طرح نہ پھیلائے۔

میں نے کمپارٹمنٹ کے مسافروں کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ چند کے سوا سبھی مسافر آرام سے لیٹ گئے تھے۔ عورتیں جتنی تھیں، اپنے گھر والوں کے ساتھ تھیں اور بچوں کو مناسب جگہوں پر لٹا کر اطمینان سے سو گئی تھیں۔

اُدھر اوپر کے برتھ پر دو مسافر شاستری جی کی ایوب صاحب سے تاشقند میں چار جنوری کو ہونے والی ملاقات کے بارے میں خیال آرائیاں کر رہے تھے۔ جنگ کی کسی بھی ملک کے عوام کو خواہش

لمبے کش کا دھواں میرے قریب سے ہو کر نکل گیا۔ مجھے ایکبار پھر کھانسی آ گئی۔

"آپ بیمار ہیں کیا؟" اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے دھوئیں کا ایک اور غبارہ اُڑا دیا۔

"نہیں" میں نے اپنی کھانسی روکتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کھانسی ہے؟"

وہ دھواں اُگلے ہی جا رہا تھا۔

"آپ کو کچھ ایٹی کیٹ بھی آتا ہے؟"

"ایک یہی بات مجھے نہیں آتی ہے"

"اسی لئے آپ اتنا سارا دھواں اُگلے جا رہے ہیں"

"او۔آئی سی!" ایک بار پھر دھوئیں کا بادل لہرا گیا۔

اُس نے اپنا ادھ جلا سگریٹ دروازے کی طرف پھینک دیا لمحہ بھر کے بعد دھوئیں کی ہلکی سی لکیر جلتے ہوئے سگریٹ سے نکل کر میری سائیڈ کے قریب لوٹ کر بکھرنے لگے۔ اس سے اتنا بھی تو نہ ہوا کہ سگریٹ بجھا ہی دیتا۔ وہ دوبارہ اپنے بستر میں گھس گیا اور قیمتی کمبل اپنے اوپر لپیٹ کر دراز ہو گیا۔ وہ شاید دو تکئے لے کر سونے کا عادی تھا، اسی لئے اُس نے اپنا تکیہ دوہرا کر لیا اور پہلے کی طرح چھت پر نظریں گاڑ دیں۔

میرے سوا شاید ہی کسی نے کسی طرح اس سرد رات کو گدا رنے کی سبیل نکالی تھی۔ جو اچھی طرح لیٹ نہ سکتے تھے وہ سمٹ کر سلیپروں کے پشتوں سے لگ گئے تھے۔ کچھ اونگھ

رہے تھے، کچھ سو رہے تھے۔ شاستری ایوب کانفرنس پر بحث کرنے
والے بھی اب خاموش تھے۔ باہر سرد ہوا کے جھونکے تھے اور بارش
تھی اور ادھر میں اپنے ہولڈال کے ساتھ لگی ٹھٹھر رہی تھی۔ بیوپاری
مسافر اکڑوں لیٹا تھا اور بیچ کی سیٹ ایک خلیج کی طرح معلوم ہو رہی
تھی، جس کی ایک طرف میں تھی اور دوسری طرف وہ بیوپاری مسافر تھا
میں اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ میں کیوں جا رہی ہوں دہلی؟ کیا تک ہے
اس میں؟ جب روما مجھ سے جان چھڑانا چاہتی تھی تو میں کیوں مر رہی
تھی اس کے لئے؟ اور اگر جانا ہی تھا تو لیڈیز کمپارٹمنٹ میں کیوں
نہ بیٹھی؟ یہاں کونسی میری سیٹ ریزرو تھی جو سلیپنگ کمپارٹمنٹ
میں چلی آئی۔ جانے کیوں مجھ میں جذباتی توازن نہیں۔ میں بہت عجلت میں
فیصلے کرتی ہوں اور اکثر میرے فیصلے غلط ہوتے رہیں۔ میرے جی میں
آرہا تھا کہ اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں اور جو گاڑی ملے اس سے لکھنؤ لوٹ
جاؤں۔ لیکن میری اس انا کا کیا ہوگا جس نے مجھے سردی میں دکھ دیئے
ہیں۔ میری نرس دوستوں میں سے کوئی بھی مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے
نہ آئی تھی کیونکہ کسی کو بھی میرا دہلی جانا پسند نہ تھا لیکن میں نے ان کی
ناراضگی کی کوئی پروا نہ کی تھی اور اپنی ضد قائم رکھنے کے لئے بغیر کسی
سے ملے اسٹیشن چلی آئی تھی اور اب کمپارٹمنٹ میں بیٹھی کھسک رہی تھی اور
لوٹ جانے کو سوچ رہی تھی۔ لیکن اب کہاں لوٹ سکتی ہوں؟ ایک قدم
اٹھانے کے بعد وہ قدم کو واپس لے سکتا ہے؟ اس دھرتی کا رشتہ
ہی اٹوٹ جاتا ہے ہم سے جس پر سے پہلا قدم اٹھ چکا ہو۔ ایسا تو
جانا ہی ہوگا اور اس سرد رات میں ٹھٹھرنا ہی ہوگا جو میری انا رسا کی

آخری رات ہوگی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے گالوں پر رکھ لیے ہائے
کتنے سرد تھے میرے ہاتھ! جیسے وہ میرے ہاتھ نہ ہوں، کسی لاش
کے کٹے ہوئے ہاتھ ہوں۔ ٹھنڈے بے جان اور بے حس میرے
جسم میں ایک تھرتھری سی ہوئی اور میری نظریں سامنے والے پرتھ
پر جم گئیں، جہاں ایک قیمتی کمبل میں سنجے آرام سے لیٹا تھا اور اس کی
رگ و پے میں حرارت اور زندگی کسمسا رہی تھی۔ مجھے ایک بار خیال آیا
سرد قیمتی کمبل اس سے چھین لوں اور اپنے ارد گرد لپیٹ لوں لیکن میرے
ہاتھ تو ایکدم بے جان تھے اور پھر میں نے کبھی کسی سے کچھ چھینا ہے،
جو اب چھین سکوں گی۔ سنجے شاید میری طرف سے بے نیاز ہو گیا تھا۔
اُس نے ایک بار پھر اپنا سگرٹ سلگا لیا تھا اور اُس کا دھواں کمپارٹمنٹ
کی سرد روشنی میں بھاری پن سے لہرا رہا تھا۔ مجھے پھر کھانسی آگئی، جسے
میں نے بہت مشکل سے روکا اور نہ جانے کیسے اور کیوں اُس کی نظریں
میری جانب اُٹھیں۔

" معاف کیجئے گا، میں بھول گیا تھا۔" اور اُس نے تقریباً تیں
چوتھائی سگرٹ دروازے کی طرف پھینک دیا۔

"نہیں، آپ پیجئے سگرٹ۔" نہ جانے کیوں مجھے اُس پر ترس آگیا۔
دروازے کے قریب دھوئیں کی ہلکی سی لکیر پھر لرز رہی تھی۔

"آپ سوکیوں نہیں جاتیں، بہت سردی ہے۔"

اُس کی بات سُن کر میرا بستر کھولنے کا ارادہ ایکدم بدل گیا حالانکہ
ایک لمحہ پہلے میں شدت سے چاہ رہی تھی کہ ہولڈال کھول کر بستر میں
گھس جاؤں۔

"نہیں کوئی زیادہ سردی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آل رائٹ۔ کیپ اون سٹنگ۔" اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں طنز کی چمک تھی۔ میں سٹپٹا گئی۔ کمپارٹمنٹ میں خاموشی تھی۔ سنجے نے اپنے ہاتھ میں البرٹ کامو کا۔ The outsider۔ لے لیا اور ماحول سے غافل ہو گیا۔

میں تلخی سے جلتی رہی اور ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی رہی۔

میں نے گھڑی دیکھی، ایک بج رہا تھا۔ اب میرے سوا کوئی نہیں جاگ رہا تھا صرف سنجے تھا جو کتاب میں غرق تھا۔ کبھی کبھار ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈال لیتا تھا۔ شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ میری کیا حالت ہو رہی ہے۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھی اور ہولڈال کھولنے لگی۔ بہت مختصر سا بستر تھا لیکن ہاتھ سردی سے اتنے سُن ہو چکے تھے کہ بستر کے سٹریپ کھلنے ہی میں نہ آتے تھے۔ بہت مشکل سے ایک سٹریپ کھلا۔ میں تو نڈھال ہو کر رہ گئی لیکن دوسرا سٹریپ کھلنے ہی میں نہ آیا میری انگلیاں درد کرنے لگی تھیں۔ میں روہانسی ہو کر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اپنی بے بسی پر آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ سارا ماحول دھندلا گیا تھا۔ میں نے دیکھا سنجے اپنے بستر سے نکل کر میری سیٹ کے سامنے آ گیا اور لمحہ بھر میں ہولڈال کا سٹریپ کھول دیا۔

"شکریہ!" میں نے کہا۔

"آپ اکیلے ہیں؟"

جانے کیوں میں اپنی سیٹ سے ایکدم اٹھ گئی۔ سنجے نے ہولڈال دونوں سیٹوں پر پھیلا دیا۔ فلیپس کھولے، پتلی سی رضائی

باہر نکالی۔ نیلا سا تکیہ رکھا، ہلکے آسمانی رنگ کی چادر بستر پر بچھا دی
اور میں خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔ ایک دم گُم سُم!

"اِس رضائی میں تو آپ کی قلفی جم جائے گی سردی سے۔ کانپ
تو آپ پہلے ہی سے رہی ہیں!"

میں کچھ نہ بولی۔ اُس نے اپنا اونی سٹیڈ کا کمبل میرے بستر پر
ڈال دیا اور میری پتلی سی ٹھنڈی رضائی اپنے بستر پر گرا دی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بس سو جائیے آپ!" اُس نے جیسے حکم دیا۔ میں اسے تکتی
کھڑی تھی۔

"کیا ارادہ ہے آپ کا؟" اُس نے ذرا قریب ہو کر کہا۔

اور میں کوئی جواب دیئے بغیر بستر پر بیٹھ گئی اور اُس نے اپنا
کمبل مجھ پر ڈال دیا اور خود ٹھنڈی برف رضائی میں دبک کر سگریٹ
سلگانے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گرم کمبل کی ہلکی ہلکی
حرارت میرے برف کی طرح ٹھنڈے جسم پر سرایت کرنے لگی
میں نے ایک بار کنکھیوں سے دیکھا، وہ The Outsider کے
صفحے الٹ رہا تھا۔ اور پھر جانے کب میں سو گئی۔ ایک آدھ بار
کسی اسٹیشن پر گاڑی کے رکنے سے نیند ٹوٹی تو سنجے کو سگریٹ
پیتے اور کتاب کے صفحے الٹتے ہی دیکھا۔

سرد ہوا کے جھونکے دیوانہ وار کھڑکی کے شیشوں سے ٹکراتے
رہے اور میں مدہوش سی ہوتی رہی۔

اچانک آنکھ کھلی تو دیکھا سب مسافر اپنے اپنے بستر سمیٹ

رہے تھے۔ سنجے کا بستر خالی تھا۔ شاید وہ باتھ روم میں تھا۔ گھڑی دیکھی، آٹھ بجنے کو تھے۔ دہلی کا اسٹیشن نزدیک تھا۔ ساتھ کا یہ پارسی مسافر شاید کسی پچھلے اسٹیشن پر ہی اُتر گیا تھا۔ ۴، ۷ اور ۵، ۷ نمبر کی سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے اب خیال آیا کہ میں رات بھر کسی اجنبی کا کمبل لپیٹ کر سو رہی تھی۔ بہت عجیب سا معلوم ہوا، میں نے ایک ایسے آدمی کا بستر استعمال کیا تھا جسے میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا بلکہ جس کے بارے میں میرے دل میں ناپسندیدگی کا جذبہ بھی تھا۔ میں نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اور پھر میری رضائی بھی تو ایک اجنبی نے استعمال کی تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے سنجے نے میری زندگی کے تمام راز جان لئے۔ جیسے میری رضائی میں بکھری روئی کی ہر تہ نے اُسے میری شخصیت کا ایک ایک رُوپ دکھا دیا ہے۔ مجھے بہت شرم محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ایک دم کمبل الگ کیا اور اُسے تہ کر کے سامنے والے برتھ پر پھینک دیا۔ اپنی رضائی اُٹھا کر اپنے بستر پر رکھ لی۔ اُسی لمحہ تولئے سے ہاتھ منہ پونچھتا سنجے آ گیا۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اتنی ناشکری ہیں۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اُس کا دُھلا ہوا شگفتہ چہرہ ایک دم اُداس ہو گیا تھا۔ مجھے گھٹنیں لگی اور رکھتے جانے کیا ہوا کہ میں نے اپنی رضائی بھی اُسی کے بستر پر پھینک دی۔

اور وہ ہنس دیا اور بولا۔

"ونڈرفل!"
اور گاڑی کی رفتار مدھم ہو گئی اور کچھ ہی لمحوں میں اسٹیشن آ گیا
- پرانی دہلی کا پروقار
ریلوے اسٹیشن جس سے میری زندگی کی بہت پیاری یادیں وابستہ تھیں۔ اور میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکی، میرا ذہن ایک دم منجمد ہو کر رہ گیا۔
سارے کمپارٹمنٹ میں ہلچل سی مچ گئی۔ میں خاموش اور ساکت اپنے بستر پر بیٹھی تھی اور میری بغل والی خالی سیٹ کے ساتھ لگا سینکے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنا گال مسل رہا تھا۔
قلی کمپارٹمنٹ میں داخل ہو کر مسافروں کا سامان باہر لے جا رہے تھے۔
"کہاں جائے گا سامان صاحب؟" ایک قلی نے اس سے پوچھا۔
"ویٹنگ روم میں۔"
قلی نے دونوں بستر لپیٹ دیئے۔ میں ایک طرف خاموشی سے کھڑی کا دیکھ رہی تھی۔ ایک لفظ بھی میرے منہ سے نہ نکل رہا تھا۔
"چلیئے" اس نے مجھے اشارہ کیا اور میں ایک بھٹکے اور سہمے ہوئے بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔
پلیٹ فارم جو ایک دوسرے میں خلط ملط ہو رہے تھے ---

مسافروں سے اٹے پڑے تھے ۔ میری ذہن کی راہ گذر پہ یادوں کی
بھیڑ لگی تھی اور اُس بھیڑ میں میرا دم گھٹ رہا تھا ۔ یادوں کی
اتنے بھاری بوجھ سے میں ہانپ رہی تھی ۔ مجھ سے تیز رہ چلا جاتا
تھا اور میں بار بار پیچھے رہ جاتی تھی ۔ اور ہر بار وہ میرے کندھے پر
بہت نرمی سے ہاتھ رکھ کر مجھے آگے دھکیل دیتا تھا ۔ آگے آگے
قلی چل رہا تھا ۔ اُس کا سامان اُٹھانے کا انداز بھی عجیب تھا سب سے
نیچے میرا بستر ، پھر سنجے کا ، پھر میرا سوٹ کیس اور سب سے اوپر
اس کا جیسے ایک ہی گھر کا سامان جا رہا ہو ۔ جیسے ہم کا سامان
جا رہا تھا وہ دو اجنبی مسافر نہیں تھے جیون ساتھی تھے ۔ یہ
سوچ کر مجھے ہنسی آگئی ۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ سنجے کی شادی
ہو چکی ہے یا نہیں ۔ سردی بہت تھی اور میرے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے
تھے ۔ ایک بار پھر غیر ارادی طور پر میری نظریں قلی کے سر پہ
رکھے سامان کی طرف اُٹھیں ۔ میں نے کتنی ناروا حرکت کی تھی
اپنی رضائی جان بوجھ کر سنجے کے بستر میں بندھوا دی تھی اور اس نے
کس معصومیت سے کہہ دیا تھا " ڈیئر فول !"
ویٹنگ روم میں پہنچتے ہی سب سے پہلے ہولڈال کھلواؤں گی
اور اپنی رضائی نکال کر اپنے بستر میں بندھواؤں گی ۔ کیا سمجھ
رکھا ہے اس نے مجھے ؟ یہی باتیں سوچتے سوچتے میں پھر پیچھے
رہ گئی ۔ یادوں کی بھیڑ میں حسین روما کی پیاری سی یاد کا چہرہ
بار بار چمک اُٹھتا تھا ۔ اُس لمحہ میں بے حد اُداس اور مضطرب تھی
اور اُسی لمحہ مجھے سنجے کے ہاتھ کا نرم دباؤ اپنے کندھے پر

محسوس ہوا اور میں بغیر اُس کی طرف آنکھ اُٹھائے بے پناہ
کیٹر کے ریشے میں بھر گئی۔ سامنے پلیٹ فارم پر لگا ہوا ننھا سا
ریڈیو سے کلاسک برف کی سی اُجلی مسکراہٹ گنگنا رہا تھا۔

ایک ڈری ہوئی لڑکی

آج وقت پیدا ہونے سے پہلے ۔
اس لڑکی نے ۔
جو سید وقت میں سٹیو گرافر ہے ۔
سٹیو لوں میں بیٹھے والے دو کر لڑکوں کے خلاف شکایت کی ہے
اس لڑکی نے ایسی شکایت میں لکھا ہے ۔
سٹیوں یوں میں بیٹھے والے سات لڑکوں سے جو مختلف اوروں
کے سٹیو گرافر ہیں، مجھے بے حد ڈر لگتا ہے۔ وہ ہر وقت میرے خلاف
سازش کرتے رہتے ہیں۔ آج کیوں کر سٹس نے مجھے شادی کا پرپوزل دیا
ہے۔ جو تمام سازش کا عملی پہلو ہے۔ دراصل یہ سب لڑکے مجھے ریپ
کرنا چاہتے ہیں۔"
وہ لڑکی اپنی شکایت پیش کرتے ہوئے زار وقطار روئی اور

بیشتر اس کے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا۔ ایک دم کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں دیر تک اس کی اس مختصر سی تحریری شکایت کو اپنے سامنے رکھے سوچتا رہا۔ اس لئے بھی کہ کیوں کرشنا میرا اسٹینو ہے اور وہ ایک شریف لڑکی ہے۔

پھر مجھے اپنے ایک دوست رام رکھا کی کوئی پچیس برس پہلے سنائی ہوئی کہانی یاد آئی۔ یہ کہانی ایک ایسی لڑکی کی تھی جسے تقسیم وطن کے دوران ہوئے فسادات میں کچھ غنڈے اس کے ماں باپ کے سامنے اٹھا کر لے گئے تھے اور اس کی عصمت لوٹتے رہے تھے اور پھر اس کے بعد اس کی مرضی کے خلاف اس سے پیشہ کراتے رہے تھے۔ رام رکھا نے کہانی سناتے ہوئے کہا تھا۔

میں ایک دن جالندھر کے اس کیمپ میں گیا جہاں تقسیم کے کوئی ڈیڑھ برس بعد پاکستان کے دور دراز علاقوں سے اغوا شدہ عورتوں اور لڑکیوں کو رکھا گیا تھا جو دونوں کی مدد سے برآمد کی گئی تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے رشتہ دار انہیں لے جائیں۔ میں بھی اپنے ایک قریبی رشتہ دار کے ساتھ ایک ایسی ہی کھوئی ہوئی لڑکی کی تلاش میں اس کیمپ میں گیا تھا۔ وہ لڑکی تو نہیں ملی لیکن ایسی ہی ایک دوسری لڑکی سے ملاقات ہوئی جس کا نام رانو تھا۔ اتنے کٹھن دور سے گزرنے کے بعد بھی اس کی شخصیت کا وقار اور حسن کی رعنائی قائم تھی۔ گفتگو کے دوران رانو نے میرے ساتھ کھڑے میرے رشتہ دار سے سوال کیا

”اگر آپ کی بہن آپ کو اس کیمپ میں مل جاتی تو کیا آپ اسے قبول کر لیتے؟“

"ہاں۔"
"آپ جھوٹ بول رہے ہیں"۔
میرا رشتہ دار خاموش رہا۔ راجو نے دوسرا سوال کیا۔
"اگر آپ کو معلوم ہو جاتا کہ آپ کی بہن کو یہ بھی اندازہ نہیں کہ کتنے مرد
اس کی مرضی کے خلاف اس کی عصمت لوٹتے رہے ہیں تو بھی؟"
میرے رشتہ دار نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد کہا۔
"ہاں۔"
"اگر آپ کی بہن آپ کو یہ بھی بتا دیتی کہ غنڈوں کا ایک گروہ اسے
جگہ جگہ لے جا کر اس سے پیشہ کراتا رہا تھا تب بھی؟"
"ہاں۔"
اس کی بار توقف پہلے کی نسبت زیادہ تھا۔
"تو آپ اپنی بہن کو تلاش کرنے میں [illegible] دیکھیے آئے دیا"
راجو نے جملہ ختم کیا۔ اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ میرا ساتھی جسے
ڈھونڈنے آیا تھا وہ اس کی سگی بہن نہیں تھی۔
لمحہ بھر کو رک کر راجو بولی۔
"میرا باپ پہلی بار یہاں آیا تھا۔ جب میں نے اسے وہ سب کچھ
بتا دیا جو مجھ پر بیتا تھا تو وہ خاموشی سے سنتا رہا اور پھر سر جھکا کر اٹھ گیا۔
میرے باپ نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ میرا دوسرا صدمہ
"اور پہلا صدمہ؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا کیونکہ اب تک
اس سے میری کوئی بات نہ ہوئی تھی۔

دوسرا صدمہ مجھے اس وقت ہوا جب غنڈے مجھے میرے باپ کے سامنے ننگا کرتے رہے اور وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ بزدل نے ایک بار بھی کسی ظالم کو نہیں للکارا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اس کے بعد میرے ساتھ کیا ہوا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک کوٹھڑی میں پڑی تھی جس کا دروازہ باہر سے بند تھا۔"

رام رکھا نے سوچا شاید کچھ دیر کیمپ میں رک جاتا لیکن اُس کا رشتہ دار اُسے زبردستی باہر لے آیا۔ جب وہ دونوں باہر آ رہے تھے تو اُس نے راجو کا اُدھڑا لیکن کھو کھلا قہقہہ سنا تھا جو قہقہہ نہیں دہشت بھرا ماتم لگتا تھا جس کا داراں کی پیٹھ پر کیا گیا تھا۔ شاید اس لئے وہ چھاتی پر زخم کھانے کے نااہل تھے۔"

رام رکھا چونکہ ان دنوں محکمہ دہری میں تھا اس لئے وہ بار بار کو ملوں کیمپس جاتا تھا اور معلوم کرتا تھا کہ گمشدہ عورتوں اور لڑکیوں میں سے ان کی تعداد کتنی تھی جنہیں ان کے گھر والوں نے قبول کر لیا تھا یا ایسی لڑکیاں کتنی تھیں جن کی گذشتہ زندگی نظر انداز کرتے ہوئے کچھ باہمت نوجوانوں نے ان سے شادی کر لی تھی۔ ایک بار جب وہ ناری نکیتن میں گیا تو اُسے معلوم ہوا کہ ایک نوجوان نے راجو سے شادی کر لی تھی۔ شادی وہیں کیمپ میں ہوئی تھی اور راجو کیمپ سے جاتے ہوئے زار و قطار رو رہی تھی۔ رام رکھا نے جب مزید پوچھ تاچھ کی تو اسے پتہ چلا کہ وہ اسی نوجوان کو جانتا تھا جس نے راجو سے شادی کی تھی۔

اُس نے اُس نوجوان کو جس کا نام دھیرج تھا ورنہ ان گنت دلیر جملوں پر سبک باد کہا جس دن میں وہ کام کرتا تھا وہاں بھی

دلی تک میری بات سنتا رہا اور پھر اس نے مجھے ایک دوسری کہانی سنائی جو دراصل پہلی کہانی کا ہی کلائمکس تھا اس کہانی کا مرا حوالہ دھیرج حاولہ کے گرد گھومتی تھی اس کہانی نے مجھے اور بھی الجھا دیا ہے میں اس وقت رام رکھا کے گھر سے ہی لوٹ رہا ہوں لیکن اپنے گھر ابھی نہیں جاؤں گا۔ دماغ ایک دم الجھا ہوا ہے ابھی کچھ دیر ادھر اُدھر گھوموں گا میں اچانک سڑک کے کنارے ایک لیمپ پوسٹ کے ساتھ کھڑا ایک بار پھر اس تحریری شکایت کو پڑھنے لگا ہوں جو شام سے میرے جیب میں پڑی ہے۔

آج شام رام رکھا نے ایک عجیب انکشاف کیا ہے جس کا مجھے گمان تک نہ تھا۔

میکے دفتر کی سٹینو گرافر لڑکی۔

جس نے آج سٹینو ول کے ساتھ سٹینو گرافروں کے خلاف شکایت کی ہے دراصل راحو کی لڑکی ہے، جس کے پیدا ہوتے ہی راحو نے خودکشی کر لی تھی۔

وہ اپنے ماں باپ کے پاس نہیں رہتی۔

وہ دفتر میں بھی کسی سے نہیں ملتی۔

صبح ٹھیک نو بجے دفتر آکر پانچ بجے چلی جاتی ہے۔

اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔

وہ اپنے نام کے آگے اپنے باپ دھیرج کی ولدیت بھی نہیں لکھتی۔

جیسے اس کا کسی سے کوئی واسطہ نہیں۔

اس لڑکی نے اپنی شکایت دفتر کے کسی اور افسر کی بجائے

پہلا دن

ہم دس دن کے اسٹڈی ٹور پر راجستھان جا رہے تھے۔
ٹورسٹ بس، ہاسٹل کے پورچ میں کھڑی تھی اور ملازم سب کا سامان رکھ رہے تھے۔ انہوں نے کمروں سے سامان اکٹھا کرکے ایک جگہ رکھ لیا تھا اور اٹھا اٹھا کر بس کی چھت پر جما رہے تھے۔ سب پہلے ہی ایسی ایسی۔ جمیدوں کی حفاظت کے لیے سامان کے ڈھیر کے پاس کھڑے تھے۔ بس کے اندر ہندی اور انگریزی میں لکھے موٹے الفاظ کو شاید سب نے پڑھ لیا تھا: مسافر اپنے سامان کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ بس ایسی ہی ذمہ داریاں خود سنبھال رہے تھے اور ایک میں تھا کہ ایسی ذمہ داریوں کا خیال کیے بغیر گیٹ کے ساتھ کھڑا سگریٹ پی رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ آج سے دو مہینے پہلے کی بات ہے جب میں ٹریننگ میں شامل ہونے کے لیے پورے بیس دن لیٹ پہنچا تھا اور ریلوے اسٹیشن سے یکہ ڈی ہو دم۔

ٹیکسی گیٹ کے اندر داخل ہوئی تھی ایسی لمحہ ایک خاتون ہاسٹل کے
گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ میں نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی اور
ٹیکسی پورچ میں آکر رک گئی۔ میں نے ٹیکسی کا کرایہ دیتے ہوئے غیر
ارادی سے طور پر گیٹ کی طرف دیکھا وہ خاتون بجائے گیٹ سے باہر
جانے کے اسسٹنٹ آئی اور میرے قریب پہنچ کر بغیر کسی رسمی تکلف
کے کہا

"تو آخر آپ آہی گئے؟"

"جی۔ مجھے"

میں اپنا تعارف کرانے لگا تو اس نے بات کاٹ دی۔

"میں آپ کو جانتی ہوں۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا ہے کہ آپ اپنی
تصویر سے کہیں زیادہ اچھے ہیں۔ تصویر اتروانا کہانیاں لکھنے سے
زیادہ اہم ہے۔ اس حقیقت کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ
مسکرا دی اور میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

ڈرائیور نے سامان اتار کر پورچ میں ایک طرف رکھ دیا اور سلام
کرکے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ لمحہ بھر میں ٹیکسی ہاسٹل کے گیٹ سے باہر
گئی۔

"آپ کا شبھ نام؟" میں نے پوچھا۔

"سادی کوریت کہتے ہیں۔" مجھے اپنے عام سے سوال کے اتنے
خوبصورت جواب کی توقع نہ تھی

"کہاں سے تشریف لائی ہیں آپ؟"

"آندھرا پردیش سے۔"

حیدر آباد میں کام کرتی ہیں"

"آپ تو جارہی تھیں کہیں؟"

"لیکچر اٹینڈ کرنے جا رہی تھی۔ آپ کو دیکھ کر رک گئی۔ سبھی چلے گئے ہیں اس وقت ہاسٹل میں کوئی نہیں"

"میرے سامان کا کیا ہوگا؟"

"ملازم لے آئیں گے آپ آ بیٹھیے"

اس نے میرا اس ملس کا دروازہ کھلوا اور میں اندر داخل ہوا میرا بریف کیس اس نے اٹھا لیا تھا

"آپ نے کیوں تکلیف کی؟"

"اس لیے کہ آپ اس سے رکے رہے تھے۔"

وہ میرے ساتھ اس کمرے میں آگئی جو میرے لئے ریزرو تھا اور کھلے۔ میں روز سے میرا انتظار کر رہا تھا، اور پھر وہ باہر چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد ہاسٹل کے دو ملازم میرا سامان اٹھا لائے۔

"چائے پیجیے گا؟" اس نے پوچھا۔

"مل جائے تو ضرور پیوں گا"

"چائے لے آؤ" اس نے ایک ملازم سے کہا۔

ہم کرسیوں میں بیٹھ گئے میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا

"کیسا انتظار رکھا یا آپ نے میں تو آپ کی جان کو"

اس نے جملہ مکمل نہیں کیا

"رو چکی تھی،" میں نے جملہ مکمل کر دیا۔

"اور کیا میاں تو ڈھنگ کا ایک آدمی بھی نہیں یہ ریس روز ریس

سال معلوم ہوتے رہی مجھے۔" اور پھر ریسٹ ٹریننگ کورس کے بارے میں روزمرہ کے پروگرام کے متعلق اور کچھ متفرق معاملوں کے سلسلے میں باتیں کرتی رہی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ میری خاطر اپنے لیکچر مس کر رہی تھی۔

"اب آپ لیکچر اٹینڈ کیجئے، میں چائے پی لوں گا۔"

"تو آپ نہیں چاہتے میں بھی آپ کے ساتھ چائے پی لوں؟"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"مگر کورس کراس نے کہا۔"

"آج کئی روز کے بعد تو چائے پینے لگی تھی۔"

"کیوں؟ ہر روز چائے نہیں پیتیں آپ؟"

"پیتی ہوں لیکن اکیلی جب تک کوئی ساتھ نہ ہو مجھے چائے کا لطف نہیں آتا۔"

"یہاں تو ڈھیر سارے لوگ ہیں"

"مگر ایک بھی ایسا نہیں جو اکیلے پن کا احساس مٹا سکتا ہو۔ ان عورتوں اور مردوں میں سبھی اکیلے ہیں۔ ایک دم اداس اور ویران کھنڈروں کی طرح بے حال اور بے حس۔ ان سے بات کرو تو محسوس ہوتا ہے جیسے کسی گنبد میں بول رہے ہوں۔ صرف اپنی ہی آواز سنائی دیتی ہے۔ پہلے سے زیادہ اونچی اور کھوکھلی۔ ایک اچھی بھلی بات کا بھی مزہ جاتا رہتا ہے۔"

ملازم چائے لے آیا۔ جواں سال لڑکا ہے نام ہے غریب چند بکاگڑہ

کار بیں والا ہے۔ گورا چٹا رنگ اور معصوم چہرہ۔ یوں ہی مسکرائے جا تا ہے۔ پہاڑوں میں رہنے والے مفلوک الحال لوگوں کی طرح جو ہنستے ہیں تو ان کی آنکھوں سے پانی رسنے لگتا ہے حسن کے گورے چہرے جیسے رسیدہ درختوں کی طرح ہیں۔ جو کسی آنے والی بہار کے انتظار میں سرنگوں ہیں۔ جانے وہ بہار کب آئے گی، جانے پھول کب کھلیں گے کلیاں کب مہکیں گی اور ان سوکھے درختوں کی ٹہنیاں سرسبز پتوں سے بھر جائیں گی اور ان کی چھاؤں میں بیٹھ کر چرواہے بانسریاں بجائیں گے اور چرواہنیں گائیں گی،

میرے محبوب بہار آگئی ہے اب تم بھی آجاؤ

میں اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کے دیئے جلائے کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں،

آجاؤ میرے محبوب۔

کہیں یہ بہار بھی روٹھ کر نہ چلی جائے۔)

میں نے ریسٹ کچھ سوچتے ہوئے عریب چند کے چہرے کی طرف دیکھا وہ ایسی بیار مسکراہٹ سے اپنے چہرے کو جگمگانے کی کوشش کر رہا تھا جیسے شروع تاریکوں کا چاند اپنی ہلکی لرزتی ہوئی روشنی سے ڈھلتی ہوئی رات کے گیسوؤں کو روشن کر رہا ہو۔ عریب چند چلا گیا اس کی بیمار مسکراہٹ بھی چلی گئی۔

میرے سامنے گرم گرم چائے کی پیالی رکھی تھی۔

"چائے پیجئے" ریسٹ نے پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ!"

"چائے لیں گی آپ؟"
"شکر ذرا زیادہ ہے"
"میں نے تو ایک ہی چمچ ڈالا ہے"
"تو پھر گھلا زیادہ ہوگا"
ریتا مسکرا دی۔ میں بھی مسکرا دیا۔
ہم چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ایسے جیسے دنیا بھر کی باتیں آج ہی ختم کر ڈالنی ہوں۔ جیسے اس کے بعد ہم دونوں ملیں گے ہی نہیں جیسے آج کا دن ہماری ملاقات کا پہلا دن نہیں بلکہ آخری دن تھا۔ آغاز اور انجام دونوں ہی عجیب ہوتے ہیں دونوں صورتوں میں ہی ملن ہوتا ہے ایک درد کا سا چٹخارا سا ہے۔ روح کے کسی نامعلوم گوشے کے ساتھ۔ لیکن اس کی بھی اپنی اپنی اہمیت ہے ہر چیز کی اپنی اپنی جگہ ہوتی ہے زندگی میں۔
"آئیے آپ کو لیکچر ہال اور لائبریری کی طرف لے چلوں۔ چائے پی چکنے کے بعد ریتا نے کہا۔
"کچھ دیر آرام کر لو تو کیا حرج ہے؟"
"لیکچر کے بعد آرام کر لیں گے"
ریتا کرسی سے اٹھی اور مجھے بھی اٹھنا پڑا۔
ٹریننگ سنٹر ہوسٹل سے زیادہ دور نہیں تھا ہم کچھ دیر میں وہاں پہنچ گئے۔ ابھی لیکچر ختم ہوا تھا اور سبھی لوگ لان میں گھوم رہے تھے۔ ہم دونوں کو دیکھتے ہی سب کی آنکھیں ہم پر جم گئیں جب تک ہم دونوں ان کے نزدیک پہنچ گئے وہ سب ہمیں ایک عجیب انداز سے دیکھتے

رہے جس میں حسد، حسد، اشتیاق، بے پیاری سب کچھ تھا
تھا قریب پہنچ کر بہت سب سے ملی، تعارف کرانے لگی تعارف
کراتے ہوئے وہ فخر اور مسرت محسوس کر رہی تھی یہ سب لوگ ہندوستان
کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے تھے سب اپنے اپنے مخصوص ماحول
اور کلچر کی چھاپ تھی سب کی اپنی زبان تھی، اپنا ادب تھا، اپنی تاریخیں
تھیں لیکن سب کچھ مختلف ہوتے ہوئے بھی ان سب میں ایک چیز
سانجھی تھی کہ وہ سب انسان تھے سب میں اپنی اپنی کمزوریاں اور خوبیاں
تھیں سب کے روشن اور تاریک پہلو تھے۔

یہ رام مورتی ہیں میسور کے رہنے والے۔ قد چھوٹا کچھ ایسے۔ دور سے
کسی ماڈل سکول کے طالب علم نظر آتے ہیں۔ آواز بھی قد کی طرح کم اونچی ہے
یہ پیلے ہیں کیرل سے آئے ہیں۔ شکل و صورت سے کیمونسٹ نظر آتے ہیں۔
لیکن ہیں پکے نیشنلسٹ۔ میں نے کیمونسٹ حکومت کی بات کی تو انہوں نے
اس کی ایک سو ایک برائیاں گنوانی شروع کر دیں۔

یہ ہیں چھٹو پادھیائے۔ مغربی بنگال کے رہنے والے۔ عمر پچپن کے قریب ہے
اگلے برس ریٹائرڈ ہونے والے ہیں ان لوگوں کی داد دیجئے جنہوں نے انہیں
اس عمر میں بھی ٹریننگ کے لئے بھجوایا ہے سب انہیں دادا کہتے ہیں
یہ کھانڈیکر ہیں مہاراشٹر سے پدھارے ہیں انہیں چھالیا
اور کتھا ہی ہر وقت جیب میں رکھتے ہیں اب بھی چھالیا کتر رہے ہیں
اور بے مطلب مسکرائے جا رہے ہیں مسکراہٹ میں کچھ بھی کہاں
خالی مسکراہٹ ہے بغیر کسی جذبے کے۔ ایک دم بے جان اور مکروہ ا
ریشا ایک صاحب ہیں اڑیسہ کے قبائلی علاقے کی نمائندگی کرتے

ہیں۔ آزادی ملے برسوں کی کسر ہو چکی کر چکی اب بھی اُن کی شخصیت میں سے
انگریزی بولتے ہیں تو کسی اور ہی زبان کا گمان ہوتا ہے۔
یہ ہیں شری ورما جی۔ راجستھان سے آئے ہیں بالکل گنو کے سمان۔
بہت ہی شریف اور سیدھے لگتا ہے کوئی بھی انہیں اہمیت
نہیں دیتا۔
اور یہ ہیں مسٹر گوڑ گورے چٹے نوجوان بہار سے سمبدھ ہے
ان کا پان کھا کھا کر دانتوں کا ستیاناس کر رکھا ہے۔ دیکھنے سے محسوس
ہوتا ہے جیسے وہ اس ماحول ہی سے نہیں بلکہ زندگی سے بھی غیر مطمئن ہیں
کچھ سہاس سے لگتے ہیں۔ لیکن فوراً کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
ادھر کونے میں دو مہلائیں کھڑی ہیں وہ اس طرف نہیں آئیں۔
بلکہ ہمیں دیکھ کر اور بھی سمٹ گئی ہیں۔ جیسے بہت بچائے بیار رہیں لیکن
اخلاق کا تقاضا ہے کہ رینت مجھے ان کے پاس لے جائے۔ سو وہ لے
جا رہی ہے۔
آپ ہیں مس سایٹ، سوراشٹر سے آئی ہیں۔ بال بہت ہی لمبے ہیں
مس صاحبہ کے۔ لیکن دانت ناہموار ہیں۔ اگر مسکرائیں نہیں تو مجموعی
طور پر بڑا اچھا امپریشن رہتا ہے
یہ ہیں مسز چٹرجی۔ عمر اور رنگ دونوں پکے ہیں پان اور زردے
کی بہت شوقین نظر آتی ہیں۔ اس وقت بھی پکے رنگ کے ہونٹوں پر پان
کی لالی مہک رہی ہے۔
”ویری گلیڈ ٹو ہیو میٹ یو“ سبھی نے کہا ہے
یہ سب لوگ تعلیمی امور کے ماہر ہیں اور اپنی اپنی ریاست سے کچھ

ماہ کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں پھر الگ ہو جائیں گے۔ کون جانتا ہے۔
زندگی میں دوبارہ ملاقات ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس سے انہوں نے مجھ سے
مل کر خوشی کا اظہار کیا ہے یہ ان کی مہربانی ہے۔ ورنہ اس دور میں کون
کسی سے مل کر حقیقی طور پر خوش ہوتا ہے اور یہ بھی وثوق سے کیسے کہا جا سکتا
ہے کہ انہیں مجھ سے مل کر واقعی مسرت ہوئی ہے یا صرف اخلاقی تقاضہ
ہی پورا کیا ہے۔

لیکن میں ان کی نیت پر کیوں شبہ کروں۔ سبھی اچھے ہیں اور اس
وقت خوبصورت لان میں کھڑے رنگ برنگے پھولوں سے گھرے اور روز
کی نرم دھوپ میں تو یہ ویسے بھی اچھے لگ رہے ہیں۔ انسان کو اچھا
یا برا اس کا ماحول بناتا ہے۔ اس میں بذات خود اچھا یا برا ہونے کی
صلاحیت نہیں۔ اچھا بھلا آدمی گھٹیا ماحول میں اپنی اچھائی کھو بیٹھتا
ہے اور نکھرے ہوئے خوبصورت ماحول میں ایک برا آدمی بھی اچھا بن
جاتا ہے۔ انسان کو پرکھنے کے لئے کوئی بھی قابل اعتبار کسوٹی نہیں۔ انسان
کو پرکھنا ہی بے کار ہے۔ جو جیسا ہے اسے ویسا ہی رہنے دو۔ اس کے
بنیادی روشن یا گمرہ پہلو خود ہی سامنے آجائیں گے۔

میں کیوں کسی کے بارے میں سوچوں!

ریت ساتھی لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہو گئی ہے اور میں مردوں کے
گروپ کی طرف لوٹ آیا ہوں۔

"آپ تو دہلی سے بہت فرینڈ لگ رہے ہیں" رام مورتی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"آپ تو ہر ہفتے اپنے گھر جا سکتے ہیں۔" یہ کھانڈیکر کی آواز ہے۔

"ہم تو اپنے گھروں سے سیکڑوں میل دور ہیں" مسٹر پٹیا یک کہہ رہے ہیں۔
"اور یہاں کا برا اچھا نہیں ہے" دادا کہہ رہے ہیں۔
معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستان کی راجدھانی میں ایک نہایت ہی اچھی کوکیلی میں رہ کر بھی یہ لوگ خوش نہیں ہیں۔ سب کو گھروں کی یاد ستاتی ہے۔ سب کے بچے ہیں، بیویاں ہیں رشتہ دار ہیں اور ان سے دور ہیں تو من میں چبھن سی ہوتی رہتی ہے اور ادھر میں ہوں کر خانہ بدوشوں کی طرح جگہ جگہ ڈیرے ڈالتا پھرتا ہوں۔ جہاں چھاؤں ذرا بھی دیکھتا ہوں، سستا لیا۔ تھک گیا تو کسی سنگ میل کا سہارا لیکر بیٹھ گیا پھر چلنے لگا۔ لگتا ہے جیسے موہ تیاگ رہا ہوں لیکن اپنی شخصیت کا موہ لڑکھڑا رہا ہے۔ شخصیت کے وقار کو ٹھیس نہ لگے۔ لگاؤ تو ایک ہی قسم کا ہو سکتا ہے لگن بٹ تو نہیں سکتی۔ وہ لگن اپنے آپ کی ہو یا دوسروں کی۔ اُسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا تقسیم کرنے سے وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ اور اس کی شکتی نشٹ ہو جاتی ہے۔ مجھے صرف اپنے آپ کی لگن ہے اور ان سب کو اپنے گھر والے اور اپنے ماحول کی۔ دونوں میں کون سا لگاؤ درست ہے۔ اس کا فیصلہ کون کرے!
ریمس ہاٹ اور مسٹر خیر جی کے ساتھ کھڑا ہنس رہی ہے

دونوں نے لان میں رکھے ہوئے پھول توڑ کر جوڑے میں لگالئے ہیں مس
ہایٹ نے جب ریبتا کے جوڑے میں پھول ٹانکنا چاہا تو اُس نے ہاتھ بڑھا کر
لے لیا جوڑے میں نہیں لگایا ریبتا نے جوڑے میں کیوں پھول نہیں لگایا
کھانڈ مکر چھیا لمبا کُرتے جا رہا ہے اور گوڑ کہہ رہا ہے کہ اُس کے سگریٹ
ختم ہوگئے ہیں۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر آفر کیا ہے لیکن اُس نے
انکار کر دیا ہے۔
" میں سگریٹوں میں صرف سٹیٹ ایکسپریس پیتا ہوں اور وہسکی میں
اِسکاچ "
میں نے سگریٹ کی ڈبی جیب میں ڈال لی ہے اور اپنے لئے ایک
سگریٹ سلگا لیا ہے۔ گوڑ یقیناً ساب ہے میرا اندازہ غلط نہیں وہسکی
کا موضوع کہاں تھا لیکن اُسے تو اپنی بات کہنی تھی
مس شرن آ رہی ہیں، لیکچر ہال کی طرف سب اپنی اپنی جگہ سے
ہلنے لگے ہیں اور ہال کی طرف جانے لگے ہیں۔ میں ابھی جگہ پر ہی کھڑا
ہوں۔
" آپ آئے ہیں یہاں سے؟" اُس نے پوچھا ہے
" جی "
" اتنا لیٹ کیوں جوائن کیا ہے آپ نے؟"
" کچھ ایڈمنسٹریٹیو اڑچنیں تھیں "
مس شرن ہال کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ میں بھی ساتھ ساتھ چل
رہا ہوں
" حیدرآباد کی مس ریبتا سٹری ایڈمائر رہیں آپ کی "

"اٹ از گڈ آف ہر" میرے جواب دیا ہے
اُدھر سے ریت آرہی ہے
"گڈ مارننگ مس سترن!"
"گڈ مارننگ آپ کے رائٹر ورسڈ آگئے؟"
"ناٹ ایگزیکٹلی اے فرینڈ۔ ہیرو ورشپ کا سینٹی منٹ ہے مس سترن"

مس سترن مسکرا رہی ہے وہ کرسچین ہے اُسے انگریزی بولنا بات کر بار بار وہ اچھا لگتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ریت کو پسند کرتی ہے۔
"تھینک ار اے گڈ گرل"
"آل گرلز آر گڈ مس سرن" میری بات سُن کر مس سترن زور سے ہنس دیں

سب لوگ لیکچر ہال میں بیٹھ گئے تھے محض اتفاق کی بات تھی کہ دیوار کے ساتھ والی قطاریں ساتھ ساتھ دو کرسیاں خالی تھیں میں اور ریت ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔
مس سترن نے لیکچر ٹیبل پر اپنی کتابیں رکھتے ہوئے کہا۔
"لیڈیز اینڈ جنٹلمین وی ہیو امنگ اس دی ریئر ماڈرن رائیٹر لیٹ اس ویل کم ہم"
ریت نے تالی بجائی کچھ تالیاں اور بجی تھیں لیکن کچھ لوگ نے جس وحرکت بھی بیٹھے رہے میں نے گوڑ کی طرف دیکھا وہ پریشان لگ رہا تھا کھانڈیکر اور رام مورتی بھی تشاد مس سترن کے برستاؤ سے

حوش نہیں تھے۔

"آئی ایم ایکسٹریملی تھینک فل ٹو یو ریڈر" میں نے گلو گیر ہو کر کہا۔ مس پیریرا نے مسکرا کر سنت کی طرف دیکھا اور میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ بات غلط ہے، نہیں ہوئی کچھ لوگ مجھے غلط بھی سمجھنے لگیں گے۔

لیکن لمحہ بھر کے بعد کوئی کیسے روک سکتا ہے مجھے تو مردگی کی بہت بڑی حقیقت نہیں، اس سے کون ٹکرا سکتا ہے لباس کے ٹکڑاؤ سے سگنیس کی لے بھی ٹوٹ سکتی ہے اور ڈھولک کی گرج بھی ابھر سکتی ہے۔ سگنیس کی لے اور ڈھولک کی گرج دونوں حقیقتیں ہیں کسی کو ایک حقیقت پسند ہے، کسی کو دوسری

لنچ کے بعد میں نے رستہ سے کوئی بات نہیں کی اپنے کمرے میں آ کر سو گیا سونے میں مجھے لگا جیسے کسی نے میرے کمرے کا دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹایا تھا کون تھا؟ تریسا کے سوا اور کون ہو سکتا ہے ایلکرائیڈ کرنے جا رہی ہوگی مجھے ساتھ لینے آئی تھی۔ سوتا دیکھ کر چلی گئی دستور کے مطابق مجھے اس وقت آرام نہیں کرنا چاہیئے تھا لیکن میں نے زبردستی ہی یہ توڑا لی تھی دستور کے مطابق کام کرنے کے لئے آدمی بھٹک بھی جاتا ہے لیکن یہ قاعدے قانون ہیں کہ محبت کبھی نہیں بھٹکتے ایسی برتری سوائے ہی جاتے ہیں۔

شام کو جاگا تو ویسے ہی بستر پر پڑے پڑے اخبار دیکھنے لگا۔ صبح خریدا تھا فرنٹ پیج پر جہاں بادشاہ کی تصویر بھی جلسے کو خطاب کر رہے تھے میں نے اس فقیر کو پچیس برس پہلے دیکھا تھا کتنا جلال تھا اس کے

پھر سے پراوراب وہ کتنا بدل گیا تھا لیکن اس کے اصول وہی تھے۔ پیغام وہی تھا، درس وہی تھا، احساس، اتحاد اور بھائی چارے کا سبق۔

دروازہ کھلا ہے رسٹ ہوگی

نہیں غریب چند ہے

"مس صاحب نے ڈائننگ ہال میں بلایا ہے"

"کیوں؟"

"چائے کے لئے"

"کہہ دو مجھے چائے نہیں پینا ہے"

"اچھا صاحب" غریب چند اپنی پیاری مسکراہٹ کو مزید پیارا بناتے ہوئے چلا گیا

کچھ لمحے گزر گئے۔

دروازہ پھر کھلا۔

رسٹ آئی ہے۔

"مجھے آج تمہیں چائے اکیلے ہی پینا ہوگی کیا؟"

"کیسے؟"

"آپ نہیں آئیے گا؟"

"چلو، کہیں کاٹ ملیس میں چائے پئیں گے؟"

"چلئے"

کچھ دیر کے بعد ہم دونوں کاٹ ملیس کی طرف چل دئے اور رسٹ کی سامنے کی پیالی میز پر پڑی ٹھنڈی ہوتی رہی جسے بعد میں کسی ملازم نے اٹھا کر

واش بیسن میں آنڈیل دیا
بس میں بیٹھے ہوئے ریتا نے پوچھا
"میرے بلانے پر آپ نے اس تلخی سے جواب کیوں دیا تھا؟"
یہ ریتا کتنی صاف دل ہے نہیں چاہتی کہ کہیں بھی غلط فہمی کی کوئی
پرچھائیں رہ جائے بڑی سیدھی لڑکی ہے
"میں اوپری ماحول سے جلدی سمجھوتہ نہیں کر سکتا اکثر تلخ ہو جاتا
ہوں"
"لیکن مجھ سے تلخ نہ ہوا کریں"۔ اس نے میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے بڑے
پُراسرار انداز میں میری طرف دیکھا جیسے اس کی آواز میں اس کی روح کی آواز
شامل تھی۔
"مجھے افسوس ہے آئندہ ایسا نہیں ہو گا"
میرا جواب سن کر وہ کنول کی طرح کھل گئی ہلکے سے سبز رنگ کی
ساڑی میں لپٹی وہ موسم سرما میں کھلنے والے پھولوں کی کلی لگ رہی
تھی۔
ایمبیسی ریستوراں میں گئے ایک زمانہ ہو گیا تھا اُن دنوں میرا ٹھکانہ
یہی ریستوراں ہوا کرتا تھا جب یونیورسٹی کے کچھ لوگ میرے ساتھ ہوا کرتے
تھے۔ کچھ ایسے لوگ، جب سے وہ بچھڑے ہیں میں نے ایمبیسی میں جانا چھوڑ
دیا ہے۔ آج ایک زمانے کے بعد ریتا کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے دروازہ
کو دھکیلا تو میرے ہاتھ کانپ گئے سب کچھ وہی تھا ویسے ہی جیسے آج سے
چار برس پہلے بکھری ہوئی تھیں لوگ بدل گئے ہیں، لیکن جگہ وہی ہے جگہیں
نہیں بدلتیں آنے والے بدل جاتے ہیں۔ منزلیں نہیں بدلتیں، راہرو بدل

جاتے ہیں میں ہال سے گزر کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر چلا گیا۔ ریسا میرے ساتھ تھی۔ کونے والی جگہ جہاں میں بیٹھا کرتا تھا، خالی تھی ہم دونوں بیٹھ گئے ایک بیرا ہانپتا ہوا پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

"بہت دنوں میں آئے صاحب؟"

"میں باہر چلا گیا تھا"، میں نے جھوٹ بولا تھا لیکن اُس نے سچ مان لیا تھا۔

"تیرا لے سرا لوگ سب چلے گئے ہیں ایک میں رہ گیا ہوں!"

"کہاں چلے گئے سب؟" اُس نے پوچھا۔

"دوسرے ہوٹلوں میں نیا کری کر لے!"

"ہمارے لئے چائے لاؤ اور کچھ کھانے کو بھی!"

"اچھا صاحب" بیرا چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد میں ایکدم خاموش ہو گیا اسی جگہ پر ہم سب بیٹھا کرتے تھے، آج سے چار برس پہلے۔ زندگی کتنی آگے نکل گئی ہے اور لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں ایک میں ہوں کہ ماضی کے تصور کو چھوڑ ہی نہیں پاتا یہ لباس جو کبھی بڑا نازک اور خوبصورت ہوا کرتا تھا۔ اب بالکل پھٹ چکا ہے۔ تار تار الگ ہو رہا ہے لیکن میں اسے ابھی اُتار کر نہیں پھینک رہا کتنا ماضی پرست ہوں چیتھڑوں کو کب تک سینے سے لگائے رکھوں گا اِسے پھینک دینا چاہیئے اب اِس میں کچھ بھی تو نہیں رہا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" ریسا نے بڑی دھیمی آواز میں پوچھا

کیا جواب دوں اُسے یہ کون ہوتی ہے میری چند گھنٹوں کی تو جان پہچان ہے اسے یہ پوچھنے کا کیا حق ہے مجھ سے۔

"کچھ نہیں سوچ رہا سوچا جا سکتا ہے"
"کنگھی ہے آپ کے پاس، بال ٹھیک کر لیجئے گا ہوا سے سب بکھر گئے ہیں"
میں نے جیب سے کنگھی نکال کر بال ٹھیک کر لئے۔
"شکریہ!"
"بس اسی طرح استاد ہمیں بھی ٹھیک کیجئے ذہن میں الجھنیں ہوں تو سوچ کا انداز بگڑ جاتا ہے"
ریت کی بات سن کر میں نے بڑی شکر گزار نظروں سے اس کی طرف دیکھا کتنی سمجھ دار لڑکی ہے۔ اس نے نظریں جھکا لیں جیسے محسوس کر رہی ہو کہ اس نے ضرورت سے زیادہ بڑی بات کہہ دی تھی۔ بات واقعی بڑی تھی اور کہنے کا ڈھنگ بڑا خوبصورت تھا۔
بیرا چائے لے کر آ گیا اور ٹرے بھر میں سارا سامان میز پر سجا کر چلا بھی گیا۔
میں نے سگرٹ سلگایا اور ریت چائے بنانے لگی
کیا ریت نے میری ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا؟ شاید لگا ہی لیا ہو شاید غلط ہو اس کا اندازہ۔
اس کے بعد ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا خاموشی سے چائے پیتے رہے کچھ دیر کے بعد ریت بولی
"جب آپ مجھ سے بور ہونے لگیں تو مجھے کہہ دیا کریں"
میں اس کی بات سے چونک اٹھا کتنا غلط آدمی ہوں میں۔ کئی دفعہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی دھیان نہیں رکھتا
"اکیلے رہنے کی عادت اس قدر راسخ ہو گئی ہے کہ دوسروں کے ساتھ

بیٹھے ہوئے بھی خود کو اکیلا محسوس کرنے لگتا ہوں اور اپنے آپ میں کھو جاتا ہوں۔"

"لیکن دوسروں کے لئے یہ ناانصافی بھی ہو سکتی ہے اور بُرا ماننے کی وجہ بھی۔"

"ناانصافی تو خیر کیا ہو گی لیکن بُرا ماننے کی بات غلط نہیں۔"

"مجھ سے آپ تکلّف برت کر خود پریشان ہوں، یہ میں نہیں چاہتی۔ مجھے آپ صاف صاف کہہ دیا کریں۔"

"لوگ تو فی صدی عورتیں تو رہتی ہیں لیکن آپ اُن میں سے نہیں ہیں۔ اچھی بھلی شام ان نکمّی باتوں کو سوچنے میں خراب نہ کرو۔ آؤ چلیں۔"

میں نے بل ادا کیا، بیرے کو ٹِپ دیا اور ایمبیسی سے باہر چلے آئے

"کہاں چلئے گا؟" میں نے پوچھا

"میں دہلی سے زیادہ واقف نہیں۔ جہاں جی چاہے چلئے۔"

"پکچر چلیں؟"

"نہیں آپ مجھے کچھ کتابیں خرید دیں یہاں صرف ایک ہی موضوع پر کتابیں پڑھ پڑھ کر تو دماغ خالی ہو جائے گا۔"

"انگریزی کی کتابیں پسند ہوں تو یہیں سے خرید لیتے ہیں۔"

"نہیں اُردو کی کتابیں خریدیں گے۔"

ہم دونوں گھومتے گھامتے جامع مسجد کے علاقہ میں چلے گئے۔ اُردو کی جو کتابیں رینا نے پسند کیں وہ خرید دیں کتابوں کا انتخاب اِس بات کا شاہد تھا کہ رینا ایک سلجھے ہوئے مذاق کی لڑکی تھی۔ میں اِس طرف بہت دنوں میں آیا تھا۔ کچھ پُرانے دوست مل گئے کچھ دیر اُن سے ملاقات رہی ادب اور فن کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی رینا نے گفتگو میں برابر کا حصّہ لیا۔ وہاں سے فارغ

ہوکہ ہم پھر کیاٹ پلیس آگئے کھانا بھی وہیں کھایا جب واپس ہاسٹل پہنچے تو
گیارہ بج رہے تھے۔

جب ہم ٹیکسی سے باہر نکلے اور چوکیدار نے گیٹ کھولا تو ادھر کے کمروں
کی بیں کھڑکیاں کھلیں اور پھر ایک دم ہی بند ہوگئیں ظاہر تھا کہ کچھ لوگ ہماری
خاطر اپنی نیند حرام کر رہے تھے۔

دوسری صبح ہمارے جانے کی خبر پہنچنے سے پہلے سب لوگ جان گئے
تھے کہ رپٹ گیارہ بجے تک میرے ساتھ رہی تھی
اور یہ ہماری ملاقات کا آخری پہلا دن تھا۔

دو کنواریاں

اُن دو عورتوں کو میں نے ہر گھڑی اور ہر موقع پر موجود پایا۔ ہلکے رنگوں کے سوٹ پہنے اور گوٹے کناری سے چمکتے ہوئے سُرخ دوپٹوں کو جان بوجھ کر اپنے سروں سے کھسکاتے ہوئے میں نے انھیں اِدھر اُدھر پھرتی سے لپکتے ہوئے بارہا دیکھا۔ دونوں کا اُونچا لمبا قد، تیکھے نقش، گورا رنگ، سڈول جسم۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں جڑواں بہنیں ہوں۔ اِسے آپ بڑی عجیب بات سمجھیں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری دلچسپی اپنی شادی کی رسومات میں کم اور اُن دو لڑکیوں میں زیادہ تھی۔ اُس وقت تو میرے لئے اپنی دلہن کی شخصیت بھی ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ کچھ لوگ کتنے جاذب نظر ہوتے ہیں۔ یہ بات مجھے اُس روز بہت شدت سے محسوس ہوئی۔ ایسی ہی ایک لڑکی مجھے اپنے پرائمری کے سیکنڈ سٹینڈرڈ میں ملی تھی۔ اپنی پیاری زبان کے ساتھ پہاڑوں کی

گودیں یہ واں چڑھی وہ دوشیزہ مجھے ایسی معلوم ہوئی تھی جیسے برف سے ڈھکی چوٹیوں کے پیچھے سے اُبھرتا ہوا سورج ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے چڑھتے ہوئے سورج کی گرم گرم کرنیں میرے رگ ویئے میں تحلیل ہو رہی تھیں اور آج پھر اُسی طرح کا احساس ہو رہا تھا مجھے اُن دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر پھر وہی مدھم سی آنچ میرے جسم میں سرایت کر رہی تھی۔

پہلی بار روشنی کے یہ ستون مجھے اُس وقت نظر آئے تھے جب برات دلہن کے گھر پہنچی تھی اور میں گھوڑی سے اُتر کر مالا ڈلوانے کے لئے آگے بڑھا تھا۔ روشنی ایک گڑیا سی ہی، ایک ہاتھ کا لمبا گھونگھٹ نکالے عورتوں کے درمیاں گھری کھڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں موتیے کے پھولوں کا ہار تھا اور اُس کے دائیں اور بائیں پہلو میں دو عورتیں کھڑی تھیں جن کے وجود سے حسن کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں مجھے محسوس ہوا جیسے روشنی کو روشنی کے دو ستون سہارا دے رہے ہوں۔ میں نے اپنے سہرے کی جھلکتی ہوئی لڑیوں سے اُنھیں دیکھا اور دونوں کا ملا جلا قہقہہ گونج اٹھا۔

" روشنی یہ کھڑی ہے ادھر!" اُن میں سے ایک بولی۔

" پہاڑ بابے چارہ کیا جائے" دوسری نے کہا۔

جیسے دونوں روشنی کے ستون ایسا اُجالا لٹا رہے تھے۔

" پہاڑی کوٹے اپنے سوتے کی دوڑ بائے!" پہلی عورت نے زور کا قہقہہ لگایا اور قہقہے کی اُس گونج میں بہت سے اور قہقہے بھی شامل ہوگئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بہت سے پہاڑی کوٹے میرے ننگے سر پہ ٹھونگیں مار رہے ہوں میں بلبلا اُٹھا۔

سونے کی چڑیا اپنے ہاتھوں میں موتیوں کی کلیاں لئے پہاڑی کوٹے کا انتظار کر رہی تھی اور پھر اُس نے پھولوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا اور موتیے کی بھینی بھینی خوشبو میرے دماغ میں لہرا گئی رام تیرتھ کے میرے سرکاری کوارٹر کے صحن میں رات کو ایسی ہی خوشبو لہرایا کرتی ہے جیسے رام تیرتھ کی چھوٹی سی لسی، اُس کے نشیب میں بہتا ہوا پہاڑی نالہ۔ اُس کی کلیوں میں چمکتے ہوئے صاف شفاف پتھر، اُس کے معصوم، صحت مند مرد اور عورتیں سبھی ایک بار میرے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے اور میری شادی پر خوش ہو رہے تھے اور جب میں نے ایسا ہار رشمی کے گلے میں ڈالنا چاہا تو وہ اُس کی ساڑی کے تاروں میں اُلجھ کر رہ گیا اور روشنی کے دونوں ستون اُس پر جھک گئے اور رشمی روشنی کے سیلاب میں ڈوب گئی

اور پھر پاٹ دار آوازیں سٹھنیاں گونجنے لگیں جن میں میری ماں، میری بہن، سر باپ، میری دادی سب پر پھبتیاں کسی جا رہی تھیں اُن دونوں سوریوں کی آواز کے انار چھوٹ رہے تھے اور اُن میں دوسری آوازوں کی پھلجھڑیاں بھی شامل ہو جاتی تھیں

جب ہم کھانے کی میز پر بیٹھے، وہ دونوں جڑواں بہنوں کی طرح مہمانوں میں گھومنے لگیں، بہت زادی اور بے باکی سے، جیسے انھیں یہ احساس ہی نہ تھا کہ وہ خوبصورت عورتیں ہیں اور غیر لوگوں کے درمیان گھوم رہی ہیں میں نے دیکھا وہ دونوں برات کے ساتھ آئی ہوئی عورتوں پر فقرے بازی کر رہی تھیں، کسی کے لباس پر کسی کے رنگ پر کسی کے لکاپ پر کسی کے بالوں پر۔

"اِس گھونسلے میں کون رہتا ہے" وہ کملا کے پاس پہنچ کر اُس کے

ینڈ ہیر کو چھو کر کہہ رہی تھی۔
"تمہاری چال!" کملانے ہنس کر کہا
"ارے میری چال تو وہ سیکھتی ہے" دوسری عورت نے مائی ساماں کی طرف
اشارہ کیا جس کے جھریوں سے بھرے چہرے پر سُرخ سالُو، بوڑھی گھوڑی لال لگام
والی بات سار ہا تھا ایک زور کا قہقہہ گونجا اور تائی ساماں کی مُردہ جھریوں
میں زندگی کا خون دوڑ گیا۔
وہ دونوں اُسی طرح گھومتی ہوئی میرے قریب آ گئیں سچ جانئے میں
تو بس اُنھیں کو دیکھ رہا تھا اور شاید وہ بھی اِس بات کو جان گئی تھیں۔
"پہاڑی کو تے اچھے کھاؤ بھی"
"یوں مدیدی آنکھوں سے کب تک ہمیں دیکھتے رہو گے"
جیسے مجھ پر گھڑوں پانی ڈال دیا کسی نے
ایک تو میرے بالکل پیچھے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی
"ایک پہاڑی جاگیردار نے کسی آدمی کو قید کر دیا"
سبھی اُس کی طرف دیکھنے لگے۔
"تم لوگ کھا ما کھاؤ کہو کو کیوں گھورے جا رہے ہو نظر لگ جائے گی
بے چاری کو!"
سب ہنس پڑے۔
"تو کوتی جا کہو! یہ تو سب کے سب ٹھوکے ہیں"
"کسی نے قید ہو جانے والے آدمی کی گھر والی کو یہ خبر دے دی بے چاری
بہت پریشان ہوئی سوچنے لگی اپنے گھر والے کو کیسے چھڑائے راجہ بڑا انصاف پسند
تھا وہ اُسے ضرور چھوڑ دے گا بشرطیکہ وہ اُس کے پاس جا کر فریاد کرے"

"وہ پہاڑن دیکھنے میں کیسی تھی؟"
"بالکل اُس مائی کی طرح لاجو" کموے میری ممانی کی طرف اشارہ کیا جو ڈیوڑی سے راستا سٹر کے جا رہی تھی ایک زوردار قہقہہ گونجا۔
میں نے جان لیا کہ اُن میں سے ایک کا نام کمو تھا اور دوسری کا لاجو۔
"تب تو اُس کا گھروالا مروا مارا ہو گیا ہوگا!"
"بس تو سہی۔ تیری زبان بڑی بے قابو ہے" کموے لاجو کو ٹھونٹ دیا۔
"پہاڑن نے سوچا، راجہ کے لئے کوئی سوغات لے جانی چاہیئے اُس نے بہت سوچا لیکن اُسے کوئی چیز نہ ملی۔ آخر اس نے جیٹھ کے پہلے کے سائے ہوئے گلگلے نکالے اور ٹوکری میں رکھ لئے!"
"وہ گلگلے کیا ہوتے ہیں کمو؟"
"یہ تو ان پہاڑنوں سے پوچھو جو کھانے پر ٹوٹ رہی ہیں"
ایک اور قہقہہ گونجا۔
"پہاڑن نے گلگلوں والی ٹوکری کو کپڑے سے ڈھک کر سر پر رکھا اور اپنے گاؤں سے راجہ کے محل کی طرف چل پڑی جو کوئی دس بارہ میل پیچھے تھا کچھ دور چلنے کے بعد اُس نے ٹوکری میں ہاتھ ڈال کر ایک گلگلا نکالا اور منہ میں ڈال لیا۔ وہ جیسوں پُرا نا گلگلا پہاڑن کے منہ میں گھلا اور گھلنے میں مزا آر ہا تھا چلتے چلتے وہ راجہ کے محل تک پہنچ گئی ما ہر سنتری کھڑا تھا اُس سے بات کرنے سے پہلے اُسے منہ میں ڈالے ہوئے گلگلے کا خیال آگیا اُسے پھینک بھی نہ سکتی تھی۔ جھٹ سے منہ سے نکال کر ٹوکری

میں ڈال دیا؟"
براتی کھانے سے دھیاں ہٹا کر کوکی بات سُن رہے تھے جو میرے پیچھے کھڑی تھی اور اُس کا دوپٹہ میری گردن کو چھو رہا تھا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا یہ کموّ کا دوپٹہ نہیں اُس کا خوبصورت نازک ہاتھ ہو۔ لیکن کموّ بے سہارا تھی۔ ایسی کہانی میں کھو گئی میں نے سر بچا کر لیا تھا اور اُدھر میری بائیں طرف لاجو کھڑی تھی جس کے بازو کا دباؤ کبھی کبھی مجھے محسوس ہو جاتا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" لاجو نے پوچھا اور اُس کے جسم کا بھرپور دباؤ میرے بائیں پہلو میں جذب ہو کر رہ گیا۔

"پھر وہ پہاڑن راجہ کے حضور میں پیش ہو گئی اور اس نے پہاڑنے کو آزاد کرانے کے لئے پرارتھنا کی اور ساتھ ہی سوغات والی ٹوکری راجہ کو پیش کر دی۔ راجہ نے ٹوکری سے کپڑا اُٹھا کر دیکھا تو مُسکرا دیا سارے گنگنے بدرنگ ہو رہے تھے۔ بس وہی ایک ٹھیک تھا جو پہاڑن نے کچھ دیر پہلے مُنہ سے نکال کر ٹوکری میں ڈال دیا تھا اُس نے وہی گنگلا اُٹھا کر مُنہ میں ڈال لیا۔ جو نہ گرا ہی راجہ کے دانتوں کے دباؤ سے ٹوٹ گیا" پہاڑن بول اُٹھی۔

"یہ سب عمر کی بات ہے راجہ جی! میں نے اِس گنگنے کو دس میل تک مُنہ میں ڈالے رکھا پر گھٹنے میں نہ آیا۔ آپ کے مُنہ میں ڈالتے ہی ٹوٹ گیا؟"
یہ سنتے ہی تمام براتی لوٹ پوٹ ہو گئے۔

انصاف پسند راجہ نے پہاڑے کو تو آزاد کر ہی دیا ہو گا لیکن وہ دونوں سوّن مجھ پر اس طرح گرے کہ میرا سارا وجود اُن کے درمیان قید ہو کر رہ گیا۔

اور جب رات کو پھیرے ہونے لگے تو وہ دونوں عورتیں رشمی کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ مجھے جو کی پر بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ لاجو نے میرا جسم چٹکیاں لے لے کر نڈھال کر دیا تھا اور پھر میرے ایک ڈاکٹر دوست نے اُس کے بھی ایسی چٹکی لی کہ وہ تلملا ہی تو اُٹھی۔

"بے شرم اِدھمیرا پہاڑی!" اِس طرح چیختے ہوئے وہ ایک طرف سرک گئی۔

لیکن سبھی ہنستے رہے کسی نے بُرا نہ مانا میرے جسم پر اُس کے بعد کسی نے چٹکی نہ لی۔

ہاں جب پھیرے ختم ہوئے تو میرے جوتے غائب تھے اور یہ کمو کی شرارت تھی۔ میں نے جوتے مانگے تو کہنے لگی۔

"میرے پاؤں کو ہاتھ لگاؤ پھر دوں گی!"

"پاؤں میں؟" میرا ڈاکٹر دوست بولا۔

"پاؤں میں چپّل ہے، اِس لئے!" اُس نے جواب دیا۔

اور جب پھیروں کے بعد ہم برات لے کر گھر کو لوٹے تو کمو اور لاجو

دولوں مجھے کوٹھی کے گیٹ تک چھوڑنے آئیں۔

صبح جب ناشتہ سے پہلے مجھے دلہن کے گھر بلایا گیا تو میری نگاہیں انہیں، دولوں کو ڈھونڈتی رہیں اور جب وہ سامنے آئیں تو میں نے دیکھا رات جگے کے خمار نے تو اسیاں اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ وہ جیسے نکھر رہی تھیں۔

جب رات رخصت ہونے لگی تو وہ دولوں موجود تھیں رشمی کو سہارے ہوئے کار کی طرف لا رہی تھیں۔ رشمی کی جھکی ہوئی نظریں آپ ہی تلوؤں پر جمی تھیں لیکن مکو اور لاجو کی نگاہیں سارے ماحول کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ ان کی آنکھوں میں محبت کی نمی تھی اور پیار کی چمک تھی اور جب انہوں نے رشمی کو کار میں بٹھایا اور رشمی کی ماں اور اس کے پتا اور اسکی بہنوں نے اُسے گھیر لیا تو وہ دولوں کہ ایک طرف الگ کھڑی ہو گئیں، اور ان کی آنکھوں کا خمار ان کے آنسوؤں میں جذب ہونے لگا میں اس گھڑی میں انہیں کو دیکھ رہا تھا یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھیں، کہاں رہتی تھیں اور کیا کرتی تھیں، کسی نے بس اتنا کہا تھا کہ وہ دلوا یولی کے نام سے مشہور ہیں، اور وہ دولوں کنواسیاں اپنے حسن کے گنوار سے پن کی رعنائیاں لٹائے جا رہی تھیں۔ اور پھر نہ جانے کیوں وہ میرے قریب آگئیں۔

”ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا“ مکو نے کہا تھا۔

”ہمارے دل شیشے کی طرح صاف نہیں“ یہ لاجو بولی تھی۔

میں خاموش تھا اور ان کی آنکھوں سے رستے ہوئے اس خمار کو دیکھ رہا تھا جس نے مجھے بہا ڈالا تھا۔

"ہماری رشمی کا خیال رکھنا"

"بڑے نازوں میں پلی ہے!"

میں پھر بھی خاموش تھا۔

"رشمی بہت نازک دل کی لڑکی ہے"

"اس کا دل توڑ نہ دینا کہیں"

میں اب بھی خاموش تھا۔ صرف انہیں دیکھے جا رہا تھا

"پہاڑی کوے، بولتے کیوں نہیں بس ٹکر ٹکر دیکھے جا رہے ہو!"

لاجو ہنس اٹھی تھی۔

مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

"تمہاری سونے کی چڑیا کو سونے کے پنجرے میں رکھوں گا۔ اسے سونے کے دانے کھلاؤں گا اور سونے ہی کا پانی پلاؤں گا۔"

"ایسا نہ کہو بابو!" لاجو نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور پھر وہ رونے لگی تھی میں نے اسٹارٹ ہوتی ہوئی کار میں سے جھک کر آخری نظر ان دونوں پر ڈالی۔ دونوں کواریں درخت کے تنے کے ساتھ لگی خاموشی سے سسک رہی تھیں۔ اپنے آنسوؤں کی آگ لیے۔

ایک ہفتہ کے بعد رشمی کو لے کر اس کے میکے آیا ہوں۔

یہ ایک ہفتہ ان کے گھر کے ساتھ ایک چھوٹی سی پہاڑی جاگیر کے ایک قصبہ کا گاؤں رام شہر میں گزارا ہے۔ میں وہاں بلانٹ ہماچل سب ڈویژن کا میڈیکل افسر ہوں رشمی اب تک جس طرح کے پہاڑ دیکھے ہیں ان میں شملہ، نینی تال، ڈلہوزی، مسوری جیسی جگہیں ہیں جہاں صرف دھوپ اور بارش کے سوا پہاڑوں والی کوئی بات نہیں۔ وہاں کے سارے شہروں اور ان پہاڑی مقاموں میں کوئی فرق نہیں۔ وہی مال، وہی رش، وہی بازار، وہی ہوٹل، ویسے ہی لوگ، صرف اتنی بات ہے کہ یہاں سب کچھ ایک اونچی سطح پر ہے جیسے پہاڑوں

کی تہذیب۔ ان کا مصنوعی پن، ان کی ظاہر داری کسی نے ایک بڑی سی طشتری میں
اٹھا کر ایک ادبی، دبیز چوبی میز پر رکھ دی ہو۔ رشمی کا تعلقات سے رام سری رنگم کے کسی
نتیجے لے جی سیل نہیں کھاتا بلکہ اسے مایوسی ہوئی۔
وہ یہاں ٹرانسسٹر پر ریڈیو سیلون سے ملی گانے تو سن سکتی ہے لیکن کسی حولو
ریستوراں میں بیٹھ کر چائے نہیں پی سکتی۔ چائے لانے اپنے کوارٹر کے ایک کمرے ہی میں
پینی ہوتی ہے جس کا کھڑکی کے سامنے چھیلی سبزی پہاڑیوں کی چوٹیاں لہراتی ہیں
اوران پر لہراتے ہوئے بادل دکھائی دیتے ہیں اور چھت پر گرتی ہوئی بارش کا آمار
سنائی دیتی ہے اور نیچے بہتے ہوئے نالے کا شور کانوں میں گونجتا ہے۔
"یہ بلیسنگ پلیس آئی کا!"
بہت اچھی ہے مارانے بیچ اٹ از ویری گڈ!"
"اور اگر یہاں مستقل طور پر رہنا ہو؟"
"آئی وونڈر آف آئی وڈ لائک اٹ!"
"لیکن دو سال تو یہاں رہنا ہی ہوگا۔"
"کیوں؟" رشمی نے جیسے چونک کر پوچھا۔
"اس لئے کہ تمہارا ریکارڈ بھیجنے سے پہلے سرکار نے تم سے کو ستر طریقہ دستخط
کرائے تھے۔"
"آپ کو سوچ سمجھ کر ریستراں ماننی چاہیے تھی۔ یو شد ہیو تھاٹ اباؤٹ دیٹ"
"آئی لیک دیٹ!"
لیکن یہ کچھ مر دری نہیں کہ مجھے دو سال یہاں رہنا ہی پڑے۔ اگرچہ مجھے یہاں بہت
پسند ہے لیکن رشمی کا خیال ہے کہ ری گیتانی ٹریشن میں میرا ٹرانسفر کسی اچھی جگہ ہو جائے
گا۔ اس لئے اس نے یہ چاہے چودن بہت سکون سے گذارے ہیں۔
رشمی کے میکے والیں آیا ہوں تو اب لو اور لالہ جی کے بارے میں وہ پہلے جیسا اشتیاق

میں رہا۔ وہ کمیشن ختم ہو چکا ہے۔ رشمی سے مجھے ان دو کنواریوں کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے جو اس نے مجھے بتایا۔

پہلی کنواری ـــ کی عمر تیس سال سے اوپر ہے۔ اس کا پورا نام کملا دیدیم ہے وہ ذات کی برہمن ہے

باپ کی موت کے چار ماہ بعد پیدا ہوئی۔ جب وہ پانچ سال کی تھی تو اس کی ماں بھی مر گئی۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا دور کے ایک رشتہ دار نے جیسے وہ چاچا کہتی تھی۔ اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ جب وہ دس برس کی ہوئی تو اس کی چاچی کا بھی انتقال ہو گیا گھر میں صرف کملا اور اس کا چاچا ہی رہ گئے۔ کملا جوان ہو گئی چاچا بوڑھا ہونے لگا کملا کے بال کالے سیاہ اور چاچا کے بال برف جیسے سفید ہونے لگے اور جب چاچا کے سر میں ایک بھی کالا بال نہ رہا اور کملا کے جسم پر جوانی پھوٹ نکلی تو ایک دن سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ چاچا نے اپنا کھیت بیچ ڈالا اور اس سے حاصل کئے ہوئے روپئے سے کملا کی جوانی خرید کر گاؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا

تب سے دونوں اس شہر میں رہتے ہیں۔ اور کملا فخر سے کہتی ہے اس کا شوہر چاچا ہے۔ اس کا خیال ہے اس کے یتیم کنوارے پن کی جو قیمت اس کے شوہر نے دی ہے دنیا میں اور کوئی وہ قیمت ادا نہ کر سکتا تھا

دوسری کنواری لاجو کا پورا نام لاجونتی ہے۔ اس کی عمر بھی لگ بھگ تیس سال ہے لیکن کمتر ہی۔ پھولتی ہوئی اور ساں اچھوت ہے

ماں باپ غریب تھے اس لئے لاجو آٹھویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکی۔ اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا لیکن ماں باپ اس قابل نہ تھے۔ اس لئے اسے مجبوراً گھر بیٹھنا پڑا۔ لیکن وہ دولت روتی رہتی تھی اسے بے حد دکھ ہوتا تھا جب اس کے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں جو اس سے کہیں کم سمجھ تھیں اگلی جماعت میں داخل ہو کر پڑھ رہی تھیں۔ لاجو بے حد ذہین تھی۔ اس لئے اس کے ماں باپ نے کچھ روپئے کرا کے

رشمی عمر کے دکان دار سے بیاہ رہا۔ وہ اس لئے راضی ہو گئی کہ اسے یقین دلا یا گیا کہ اسے
اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہے اور دکان دار لالا نے کالج تک پڑھانے پر رضامند تھا جو محض
لالچ دینے کا ایک حربہ تھا۔ رشمی نے اپنا مسئلہ اور اپنی جوانی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گروی رکھ دی لیکن اسے جلد معلوم
ہو گیا کہ لالا نے سب جھوٹ کہا تھا۔ کچھ عرصہ وہ صبر کرکے پڑی رہی اس دوران میں اس کے ہاں
ایک لڑکا بھی ہو گیا۔ لیکن لالا کو دمے کی شکایت تھی اور شک کا مرض تھا لا محالہ اسے کھود
ہاتھوں سے پلنی لیکن اپنی آبرو کی حفاظت کرتی

اور پھر ایک دن وہ اپنے لڑکے کو لے کر لالا کا گھر چھوڑ گئی اور اپنے ماں باپ کے گھر آ گئی۔ ماں باپ کا
سلوک اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ ادھر لالا انہیں اسی طرح تنگ کئے جا رہا تھا۔
آخر ایک دن وہ ایک نوجوان کے ساتھ نیا شہر چھوڑ گئی۔
اس نوجوان نے اسے لڑکیوں کے ایک سکول میں داخل کرا دیا لیکن
اب وہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔ اب اس کی توجہ کئی طرف بٹ گئی تھی۔ وہ کچھ
روز تو کوشش کرتی رہی کہ پڑھنے لکھنے کی طرف دھیان دے لیکن اسے
کامیابی نہ ہوئی آخر اس نے سکول جانا چھوڑ دیا۔ وہ نوجوان لاجو سے
بے حد محبت کرتا تھا اور ہر ممکن کوشش سے اسے خوش رکھتا تھا وہ دن
میں ایک بینک میں چپڑاسی کا کام کرتا اور صبح اور شام اخبار بیچتا تھا
اب وہ نوجوان رشمی کے پتا کے ایک دوست کے یہاں کلرک تھا اور لاجو
کا لڑکا اسکول جاتا تھا لیکن نالائق تھا۔ اس کی ماں بے حد دکھی تھی۔
رشمی نے مجھے نہایت مختصر انداز میں ان دونوں کنواریوں کی داستان
سنا دی تھی۔ جو اس نے دوسروں سے سنی تھی۔ وہ دونوں ابھی آزادہ
روی اور رنگین مزاج ہونے کے لئے مشہور تھیں۔ ان دونوں میں بہنوں
جیسا پیار تھا۔ ان کی ایک ہی جیسی مجبوریوں نے انہیں ایک ایسے مقام

پر ملا دیا تھا کہ اب وہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو گئی تھیں ۔ میں نے رشمی سے کوید کر کے اپنے بے مدعا دلچسپی کا اظہار نہ کیا مبادا کہ وہ جان جائے کی کوشش کی کہ اس کے گھر سے ان دو کنواریوں کا کیا تعلق تھا اور وہ انہیں کب سے جانتی تھی ۔

میں جب رشمی کے میکے آیا تو میرا خیال تھا کہ مکو اور لاجو وہاں پہلے ہی سے موجود ہوں گی اور مجھ سے دیسی پنجابی ماں کی سے بات کریں گی اور مجھے پہاڑی کوا کہہ کر پکاریں گی ۔

لیکن ایسی بات نہیں ہوئی ۔ میں سوچتا ہی رہا ان سے کہوں گا کہ میں نے ان کی طوطے کی چوری یا کو طوطے کے پنجرے میں قید کر دیا تھا اور اسے طوطے کے دانے کھلا رہا تھا اور طوطے کا پانی پلا رہا تھا ۔ میں نے سوچا تھا کہ میں انہیں خوب چھیڑوں گا اور ان سے پوچھوں گا کہ لوگ انہیں دو کنواریاں کیوں کہتے ہیں ، اور وہ شادی کیوں نہیں کرتی ہیں ۔ میں تو ان کے لئے امرتسر کے دو ایک ایسے پہاڑیے کا ذکر کر ڈالا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا ۔ میں نے ایک بار صرف ان کا گیت گنگنا کر اپنا ہوا محسوس کیا جب شام کو ڈھولک پر انہوں نے سارنگی گایا

کوٹھے کوٹھے آ گوریئے
تیوں ستو دا یار دکھا داں

اور پھر ان کے قہقہوں کا آثار بھی گر گیا اور پھر ایک بار ان دونوں کے ہم خیالوں کا دھمک کی کھلی تھی اور پھر اچانک وہ کھیلے دروازے سے

باہر ہو گئی تھی۔

"رشمی بھاگ گرائی تھی میرے کمرے میں۔

گتو اور لاجو بار احمد ہو کر چلی گئیں!"

"کیوں!"

میرے دھچکا سا لگا۔

"میں نے ان سے کہہ دیا کہ علی نے ان کی کہانی آپ سے کہہ ڈالی ہے۔"

"بڑا ظلم کیا تم نے رشمی!"

رشمی ایک دم خاموش ہو گئی۔ خاموش اور افسردہ!"

اتنے میں ایک بزرگ جس کی عمر ساٹھ سے اوپر ہو گی اور ایک بارہ تیرہ برس کا لڑکا گیٹ کے اندر داخل ہوئے اور اسی لمحہ گتو اور لاجو گیٹ کی طرف بڑھیں۔

"یہاں کیا کرنے آئے ہو تم کتو!"

دونوں کی آواز کڑکی۔

اور وہ بزرگ اور وہ لڑکا دونوں سہمے ہوئے سے گیٹ سے باہر نکل گئے۔

"یہ گتو کا خاوند اور لاجو کا لڑکا ہے" رشمی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے کھڑکی کے قریب ہو جانے کو دھکیلا۔ میں انہیں ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا

میں تو غلط مذاق کر ڈالنے والا تھا۔ یہ ابھی ظلم ہوتا اگر میں گتو اور لاجو کے لیے رام ستھر کے ایسی بیابتے تجویز کر دیتا۔ اور لاجو کا "۔۔ ماں کنواریں اور بے یک خوانی تو ایسی تصویریں را سے حالات اور

سماج کے ٹھیکیداروں نے کبھی بار شادی کر چکی تھی اور یہ جو ساٹھ برس کا بوڑھا اور تیرہ برس کا لڑکا دونوں ساتھ تھے، ان میں ایک گزشتہ تھا یہ دونوں ان مجبوریوں اور ان حالات کی اولاد دکھائی دیتے تھے جن سے گنوار لاجو کا بیاہ ہوا تھا۔

یہ دونوں سماج کی گندگی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے یہ دونوں بھائی تھے۔ ایک پچاس برس بڑا ایک پچاس برس چھوٹا۔

لیکن ان دونوں کا کنوار اور لاجو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کنوار اور لاجو بھی غیر شادی شدہ تھیں۔ کیونکہ کنول کی محبت کا بیاہ کسی نہیں ہوا تھا ان کی محبت کو کوئی منڈپ نہیں ملا تھا، اس کی کبھی ڈولی نہیں اٹھی تھی۔ اُس کی مانگ میں کسی نے سیندور نہیں ڈالا تھا ان کی محبت اب تک کنواری تھی۔

میں دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا اور رشمی دیر تک اپنا گال میرے کندھے پر ٹکائے میرے ساتھ لگی پرانتیت کرتی رہی اور پھر میں نے رشمی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

گیٹ کے دونوں حصے اپنے بے حال بازو پھیلائے جانے کس صبح کا انتظار کر رہے تھے۔۔

~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~

گوری چٹی دھوپ

ہو سامنے تھا اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تو مجھے محسوس ہوا، کالج
ہال کی اس دلکش جیومیٹری کی فضا میں کھلی سی روشنی اور لطافت کی سی
شفاف دھوپ پھیل گئی تھی اور ہال میں بیٹھا ہر شخص اسکی حرارت
سے راحت محسوس کرنے لگا تھا

میں کورٹ میں لگی ان تین کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا جو
مہمانوں کے لئے مخصوص تھیں۔ میرے دائیں پہلو میں مس ادرائٹ تھیں
اور بائیں پہلو میں ڈاکٹر مدھو سودن مس ادرائٹ اس کالج کی اولڈ
سٹوڈنٹ تھیں اور الہ آباد سے صرف اس سالانہ تقریب میں شرکت
کرنے کے لئے بلائی گئی تھیں۔ ڈاکٹر مدھو سودن یہاں کے سول
سرجن تھے اور ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ میں یہاں کا ایک ایڈوکیٹ
ہوں اور بہت سی سماجی سرگرمیوں میں حصّہ لیتا ہوں۔ کسی زمانے
میں دس ناول میں نے لکھے تھیں، جن کی کمائی اب تک کھا رہا ہوں
لیکن پیشہ وکالت نے مجھے ادب سے بالکل الگ تھلگ کر دیا۔ لکھنے
کا تو نہیں لیکن پڑھنے کا شوق اب بھی ہے۔ مس ادرائٹ بہت سکوچ
سے بیٹھی تھیں اور بات چیت صرف ڈاکٹر مدھو سودن ہی سے ہو رہی
تھی۔ لیکن جب گیت اسی لہر پر ختم کر کے لڑکی اسٹیج سے اتری تو تالیوں
کی گڑگڑاہٹ میں مس ادرائٹ کی آواز ابھری۔

مارولس - ایکسکوئزٹ
وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں۔
، ویری ماچ ، میں نے جواب
مس ادرائٹ نے گھبرا کے جواب میں دیکھ کر اور پھر میری نگاہیں

دھوپ کے اس ٹکڑے کا تواقب کرتی رہیں جو ایک دم ٹوٹ کر گر گیا تھا اور کالج کا حال پیروہی پرانا نیم اندھیرا' ہال سی گیا تھا
جوں کا فیصلہ سنانے کے لئے مجھے سی ڈائس پر جانا پڑا۔ مقامی۔
کالج کی مس گپتا کو شک اول ہی لیکن اسے انعام نہیں ملا تھا کیونکہ
تقاریکالج کی ٹیم انعام یا شیلڈ حاصل نہیں کر سکتی تھی شیلڈ باہر سے آئی
ہوئی ایک ٹیم کو ملی اور سب میں فیصلہ کا اعلان کر کے ڈائس سے
نیچے اترا تو تالیوں کا شور ایک حاص لے سے گونجے جا رہا تھا اور گیبا
سامنے بیٹھی اپنی معصوم اور کھلی مسکراہٹ کی دھوپ پھیلا رہی تھی اور
سارا ماحول اس گوری چٹی دھوپ میں جگمگا رہا تھا
اور پھر گروپ فوٹو ہوا۔
مس اور برا بٹ، ڈاکٹر مدھو سودن اور میں پرنسپل کے ساتھ کرسیوں
پر بیٹھے تھے اور ہمارے پیچھے کو نٹیسٹ میں حصہ لینے والے لڑکے اور لڑکیاں
اور محض اتفاق کی بات تھی کہ گپتا کو شک میری کرسی کی ٹیک پر کھڑی تھی
اور میں نے جب پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی اور اس کے ناک
کے لونگ کی سفید کی دھوپ کے کسی ٹکڑے سے جگمگا کھا فتاب سی گی
تصویر اتر گئی اور ہم سب چائے کی میزوں کے گرد کھڑے ہو گئے گپتا نے
چائے کی تین پیالیاں بنائیں ایک مس اور براٹ کو دوسری ڈاکٹر مدھو سودن
کو اور تیسری مجھے اونتر کی۔
یہ سر پلیز
میں نے پیالی لیتے ہوئے کہا۔
یو بیٹر آل رائٹ سر، گپتا نے جواب دیا

"یہ سو کیوں؟ اس تو میں سچ مچ ہنس ہوں گی"
وہ مسکرائی اور اس کے جسم کی پتلی سی جھک دوہری ہو گئی۔
"کوئی غم سا نہیں ہے"
اس نے وضاحت کی۔
"اب تو گواہوں پر جرح کیا کرتا ہوں بخار لیں تو بھول بھال گئیں۔
"میرے ڈیڈی تو آپ کی بہت تعریف کیا کرتے ہیں جی"
"کیا نام ہے تمہارے ڈیڈی کا؟"
"مسٹر ہر پرشاد کوشک، ایس۔ ڈی۔ او"
"ہائی سی! تم ان کی لڑکی ہو؟"
"جی!"
میں نے قریب ہو کر اس کے کندھے کو تھپتھپایا اور دل ہی دل میں دعا دی، اے خدا اس اعلیٰ دھوپ کو کبھی کوئی سایہ اپنے کرخت ہاتھوں سے ملنے کی کوشش نہ کرے یہ دھوپ دوپہر میں بدلے اور زندگی کی تمام تر رعنائیاں اس میں سما جائیں!"
"جیتی رہو!"
"ٹھیک ہو انکل!"
اس کا انکل کہہ کر مخاطب کرنا مجھے اچھا معلوم ہوا میری اپنی کوئی بیٹی نہیں سنجیدہ اور خوبصورت لڑکیاں اور بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن میں ہر اچھی لڑکی کو دیکھ کر محسوس کرتا ہوں کہ کہیں کسی شہر یا گاؤں میں ایک چھوٹا سا گھر زندگی میں خوبصورتی لائے گا۔ ایک چھوٹا سا گھر ہندوستان کی آبادی میں خوبصورت اضافہ ہے گا۔ ایک آنگن میں خوبصورت محبت کے کھیلیں گے

ایک مردوتحال اور مطمئن زندگی بسر کرے گا۔ کہیں کسی چھت پر چاند
اپنی چاندنی بکھیرے گا اور ستارے اپنی روشنی لٹائیں گے اور دیواروں کے
اندر قہقہے گونجیں گے اور مسرت کے پھول مسکرائیں گے۔ میں کسی بھی جگہ کسی
پیاری سی لڑکی کو دیکھتا ہوں تو مجھے زمانے کیسے سکون اور اطمینان کی
بے پناہ دولت مل جاتی ہے۔ میں ذہنی طور پر یکدم بہت متاثر ہو
جاتا ہوں
میری آٹوگراف بک پر کچھ لکھ دیجئے ناہ کہتا ہے اس آٹوگراف
بک میرے سامنے کر دی۔
مجھے محسوس ہوا جیسے اس نے اپنی معصوم زندگی کا سعید اشعاف
بے داغ ورق میرے سامنے رکھ دیا۔ میں سوچنے لگا اس ورق پر کیا لکھوں
اس ال کبھی کہانی پر کون سا عنوان درج کروں؟ ایک لمحہ میں کلی کی تیزی کے
ساتھ کئی خیالات آئے، کئی جملے سوجھے، ایک آدھ شعر بھی یاد آ گیا لیکن
جب میں اس کھلی کتاب پر لکھنے لگا تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں اس ایسی
طرح مرکوز ہو گئیں کہ میں جو کچھ لکھنا چاہتا تھا سب بھول گیا میں نے
قلم روک لیا۔
"آپ نے قلم روک کیوں دیا؟"
اس کی ہمت اور حوصلہ بری آنکھیں میرے سامنے کھلی تھیں اور اس کے
صحت مند چہرے کی دھوپ میرے سامنے پھیل گئی تھی۔
"سوچ رہا ہوں کیا لکھوں!"
"میرے لئے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا آپ کو؟"
اس نے انجانے ہی میں میرے دل کی کیفیت بیان کر دی تھی۔ میں

خاموش رہا اور کھلے صفحے پر آپ سے آپ ایک شعر کی پرچھائیں پھیل گئی۔
گوری جیٹھ دھوپ جو بن پر اترائے
دل کے پیچھے کالی کالی رات لگی ہے۔

پر کیا لکھ ڈالا میں نے اگیتا اردو نہیں جانتی تھی۔ وہ اسے پڑھ نہ سکی۔ لیکن مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے بہت بڑا جرم کر دیا ہو۔ میری زندگی کا احاطہ کئے ہوئے میرا سکی پر ایک بار پھر اپنی گرفت میں لے کر مجھ کو دے رہا تھا۔ میں نے قلم جیب میں رکھ لیا اور آٹوگراف بک گیتا کو لوٹا دی۔

"دیکھی میں ٹھیک بالکل"، اس نے آٹوگراف بک لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور اسی لمحہ بالوں کی ایک لٹ جانے کیسے الگ ہو کر اس کے ماتھے پر جھول گئی۔ اور جانے کیوں میں نے جیب سے قلم نکال کر آٹوگراف بک پر لکھے ہوئے شعر کو کاٹ دیا۔ وہ بہت جھنجھلائی ہوئی اور حیرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور میں قلم کی نوک پر زور دیئے کی حد تک روز نمائے شعر کے ایک ایک لفظ کو کاٹ رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں"

"کیا آپ ناراض ہو گئے ہیں مجھ سے؟"

"تم سے تو خدا بھی ناراض نہیں ہو سکتا گیتا! میری کیا مجال ہے!"
میں نے جواب دیا۔

گیتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنی آٹوگراف بک واپس لے لی اور مجھے محسوس ہوا اس کے چہرے پر پھیلی دھوپ ایک دم مدھم ہو گئی تھی۔

"رانکل بہت اچھی پکچر ہے" - فیلڈنگ کا ناول ٹام جونز تو بہت ہی مشہور ناول ہے۔"

"ہاں لیکن آج موڈ نہیں ہے"

"اچھا بائی بائی کبھی گھر آئیے نا انکل؟" اس نے بالکنی کے اس چیس کی طرف بڑھتے ہوئے فقرے کا آخری حصہ ادا کیا۔

"آؤں گا کبھی" حسن دستاس کا وہ ریلا آگے نکل گیا اور کناروں پر کھڑے لوگ چھپکلیوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

میں پکچر ہال میں جانے کے بجائے گھر واپس آگیا۔ کتابوں کی الماری سے ٹام جونز نکال کر پڑھتا رہا اور رسیا کا سہرنگ کا تحفہ اسی میز پر رکھ کر سو گیا طبیعت میں بے حد اضمحلال اور تھکن تھی۔ اس رات میں اپنے کیسز بھی اچھی طرح تیار نہ کر سکا گیتا کے شگفتہ، معصوم اور پاکیزہ چہرے کی دھوپ بار بار میرے سامنے کھیل جاتی۔ سونے سے پہلے میں نے ایک ایسی لڑکی کے لئے جس سے میرا کوئی رشتہ نہ تھا جو عمر میں بیٹی کے برابر تھی جس کے ساتھ میں کوئی بھی رشتہ قائم نہ کر سکتا تھا۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے دعا کی، اس کی عمر کے لئے اس کے سکھ کے لئے اور اس کی خوشی کے لئے!!

اگلی صبح میں بے حد خوش تھا۔

پھر کئی مہینوں تک گیتا نظر نہ آئی۔

آخری بار اس سے اس شام ملاقات ہوئی جب اس کے پتا پرشاد کوشک کا ٹرانسفر ہوا تھا اور کلب میں پارٹی تھی کلب میں جب کبھی کوئی پارٹی ہو صاحب بہادر کا مرہونِ ہے اور دیر تک رونق رہتی ہے۔ جب پارٹی ختم ہو جاتی ہے تو لوگ اور رمی کے رسیا گئی رات تک بیٹھے رہتے ہیں۔

اپنے اپنے گلاسوں سے ہلکے ہلکے سپ لیتے ہوئے سگریٹ پھونکتے رہتے
ہیں اور ہار جیت کا حساب کتاب کرتے رہتے ہیں۔ آفس پارٹی میں بھی
یہی کچھ ہوا تھا۔

انمول گینا نے سیف کی ایک بہت پیاری سی غزل گائی تھی۔

ابھی رہنے دو کہ تاروں کا دل دھڑکتا ہے۔
تمام رات پڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ۔
پھر اس کے بعد کبھی ہم نہ تم کو روکیں گے۔
یہ فیصلے کی گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

محسوس ہوا تھا جیسے گیتا اپنی دوست لڑکیوں کو، شہر کی گلیوں اور سڑکوں
کو چھوڑتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا تھا۔ وہ بے حد اداس تھی اور اس کی آواز میں
جیسے اس کا غم سلگ رہا تھا۔ میں نے اس تپش کو محسوس کیا اور سوچا، انسان
کو اپنے سمندر، اپنے لگاؤ، اپنے تعلقات ٹوٹتے ہوئے کتنی تکلیف ہوتی
ہے۔ تعلقات جب بنتے ہیں تو خبر بھی نہیں ہوتی۔ بس آپ ہی آپ بن جاتے ہیں
ارمان میں ایک مضبوطی اور گہرائی آ جاتی ہے۔ لیکن جب ٹوٹتے ہیں تو آنکھیں
ویران ہو جاتی ہیں اور دل کے آنگن سونے ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف کھنڈر نظر آتے ہیں
جیسے سمندروں کی ایک ایک کرچی ادھر ادھر بکھر گئی ہو اور جہاں پاؤں پڑے
وہیں ترسی کرچیاں چبھ کر لہولہان کر ڈالے۔ بس ایسی ہی کیفیت گیتا کی تھی۔
اس کی سہیلیاں ایک طرف کھڑی سسک رہی تھی اور ان سسکیوں میں گیتا
کا اپنا غم بھی شامل ہو گیا تھا۔

"آپ کی بیٹی بہت بڑی انٹلکچوئل ہے گی کوشک صاحب!"
میری یہ بات سن کر کوشک صاحب بولے

"میں نے بڑی لگن سے پرورش کی ہے گیتا کی۔ مجھے اس پر فخر ہے"

"بھگوان کرے آپ کا یہ فخر قائم دائم رہے!"

اور اسی لمحہ گیتا اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہمارے پاس آگئی۔

"انکل! آپ نے آج بھی غزل نہیں سنائی؟"

"میرے پاس تمہاری جیسی آواز نہیں بیٹی! ہم لوگ ایسی ہی محفل میں جم سکتے ہیں یہاں نہیں!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے وہ آٹوگراف والا صفحہ اب تک سنبھال کر رکھا ہے۔"

اس نے جس شکایت بھرے لہجے میں یہ بات کہی اس سے ظاہر تھا کہ گیتا نے اب تک مجھے معاف نہیں کیا تھا۔ کاش وہ جانتی کہ میں نے اس کی خوشی ہی کے لئے اسے ناراض کیا تھا۔

"تمہارا انکل ایسا ہی ہے۔ چلو کسی بہانے یاد تو کرو گی۔"

"یاد تو کروں گی ہی!"

"اب ہم تمہاری شادی میں غزل سنائیں گے۔"

"پھر تو آپ سنا چکے غزل۔ ابھی دس بیس برس تک اس کی امید نہیں اور جب تک۔۔"

"اور جب تک شاید یہ محفل ہی اٹھ جاسکے"

"انکل ڈونٹ بی سلی! ارے یہ کیا کہہ دیا میں نے!" اس نے ایک دم ڈرتے ہوئے کہا۔

"گیتا! تم نے غصہ میں آکے کہہ ڈالی ہو!" کوشک صاحب نے ڈانٹ سا دیا۔

"آئی ایم سوری انکل!" گیتا میرے قریب آگئی اور میں نے نہ جانے

کیوں اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

"تم ہمیشہ سکھی رہو۔ زندگی کا کوئی غم بھی تمھیں پریشان نہ کر سکے"
گیتا کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے اپنا ہاتھ میرے گال سے لگا لیا۔

اس رات میں نے پہلی بار اس تصویر کو غور سے دیکھا جو کالج کے ڈیکلیمیشن کونٹیسٹ میں کھینچی گئی تھی اور جس میں گیتا میری کرسی کی پشت پر کھڑی تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے گیتا اپنی معصومیت کی ساری نکھر مجھ پر انڈیل رہی ہو۔ میں نے تصویر پر جمی گرد کو اپنے رومال سے پونچھ ڈالا۔

اور آج جب میں نے گیتا کو دیکھا ہے تو ہمارے درمیان لمحات کی گرد نے ایک بہت اونچی دیوار کھڑی کر ڈالی ہے۔

میں ہائی کورٹ میں ایک کیس کے سلسلے میں چنڈی گڑھ آیا تھا۔ دو دن بے حد مصروف رہا۔ آج شام تھوڑی دیر کے لئے اس جھوٹے سے ریستوران میں آگیا ہوں۔ یہ ریستوراں نہ جانے مجھے کیوں اچھا لگتا ہے۔ میں جب بھی آتا ہوں کونے میں لگی آخری ہی میز پر بیٹھتا ہوں۔ آج بھی وہیں بیٹھا ہوں۔ یہ گوشہ اندھیرا سا ہے۔ یہاں بہت کم لوگ بیٹھتے ہیں وہ جو دوسروں کی نظروں سے دور رہنا چاہتے ہیں یا وہ جو ہنگامے سے الگ کٹ کر اپنی ہی دنیا میں سمٹ کر شامل ہونے کی کوشش کریں۔ میں نے کافی کی پیالی سامنے رکھے سگریٹ پی رہا ہوں۔ تمہارے ہی کی خواہش کے ساتھ جب بھی ریستوراں کا دروازہ کھلتا ہے نظریں ادھر اٹھ جاتی ہیں۔ کبھی تو خوش ہو جاتا ہے کبھی جذبات سپاٹ رہتے ہیں

اور کبھی طبیعت مصلحتاً الٹی سی ہے۔ یہ اسلام آنے والوں کی شخصیت کے مختلف
ردعمل ہیں۔

ریستوراں میں بیٹھے کچھ لوگوں کا جائزہ لے رہا ہوں۔
درمیاں کی بڑی سی میز کے گرد کچھ الٹرا ماڈرن قسم کی لڑکیاں بیٹھی
ہیں غالباً یونیورسٹی سٹوڈنٹس ہیں۔ لیمر ڈ ہیر، سلیولیس بلاؤز
ہائٹ ہیر۔ ہر بات میں بناوٹ، ہر انداز میں تصنع۔ اتنے زور سے قہقہے
لگاتی ہیں کہ سب ان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

اور اس میز کے بالکل سامنے والی میز پر کچھ لڑکے بیٹھے ہیں سگریٹ
پر سگریٹ پھونکے جا رہے ہیں حرکات اتنی غیر متوازن ہیں جیسے کرسیوں
پر بیٹھے ہوئے بھی ٹوسٹ کر رہے ہیں ان کی خواہش ہے کہ وہ سب کی نظروں
کا مرکز بنے رہیں۔

یہ دو لوگ میرے ہمارے نظام کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ نئی نسل کی ولولہ
کی، نظریات کی، رجحانات اور آدرشوں کی۔ یہ دونوں میرے گویا دو الگ
الگ جزیرے ہیں دو الگ الگ دنیائیں ہیں، دو الگ الگ آسمان ہیں
دو الگ الگ زمینیں ہیں۔

اور وہاں سے پرے آج کے سیاسی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے
کچھ سیاسی پارٹیوں کے کارندے بیٹھے ہیں جنہیں عوام کی دگرگوں حالت
کا بے حد افسوس ہے جنہیں مہنگائی نے پریشان کر رکھا ہے جنہیں بھوکے
موٹے بہت سے غم ہیں لیکن ان سب غموں پر ان کا اپنا غم غالب ہے اور
یہ چیدہ اشخاص ہزاروں سالوں کے تخیل [illegible]
کر سب کچھ دیکھ رہے ہیں جیسے یہ وہ مصنوعی [illegible]

امریکہ اور روس نے آسمانی علاقوں میں گردش کرنے کو چھوڑ دیا ہو۔ لیکن ہمیں دھرتی کی مخلوقات سے کوئی لگاؤ نہیں۔

کچھ لوگ اٹھ کر جا رہے ہیں کچھ آ رہے ہیں میں اسی انداز سے کونے میں بیٹھا ایسی ٹھنڈی ہوتی ہوئی کافی کو دیکھے جا رہا ہوں میری قنوطیت کچھ دنوں سے پھر مجھے اپنی گرفت میں لئے جا رہی ہے۔ میں نہ جانے کیوں قنوطی ہوتا جا رہا ہوں نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے، اس ریس کورس میں سبھی گھوڑے دوڑ چکے ہیں۔ اب یہ گھوڑے میرے نزدیک دوڑیں گے جب تک نئے گھوڑوں کی سپلائی نہیں ہوتی اس ریس کورس میں پرانے گھوڑوں کی لید پڑی سڑتی رہے گی اور وہاں تعفن پھیلا رہے گا۔

میں نے ٹھنڈی ہو چکی کافی کی ساری پیالی ایک ہی گھونٹ میں ختم کر ڈالی ہے میری میز کا ویٹر بھی میری طرف توجہ نہیں دے رہا ہے اس کا دھیان دوسری دو میزوں پر ہے۔ جہاں ایک طرف ایک لڑکا اور لڑکی آکر بیٹھے ہیں اور جہاں ایک فوجی افسر اپنے ایک دوست کے ساتھ خوش گپیاں کر رہا ہے۔ میں اپنی کم مائیگی پر جھلا رہا ہوں۔ حالانکہ میری جیب میں اس وقت بھی ہزار سے زیادہ روپوں کے نوٹ پڑے ہیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے اس کا احساس تو کسی جیب کترے ہی کو ہو سکتا ہے۔ ویٹر کو شاید مجھ سے کسی خاص ٹپ کی بھی امید نہیں۔ میں نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا ہے اور ویٹر کا انتظار کر رہا ہوں جو لڑکی کی طرف سے مل کر اپنی رنگ دار پیٹی کے اندر سے ایک نگاہ غلط انداز ڈالنے کی بھی فراخ دلی نہیں کرتا۔

عجیب بیزاری سی محسوس ہو رہی ہے۔
ریستوران کا دروازہ پھر کھلا ہے۔ پھر کوئی اندر آ رہا ہے۔
ایک بہت ہی بے ہنگم سا آدمی ہے۔ توند لٹکی ہوئی گہرا گندمی رنگ
کھڑی ہوتے ہوئے بال۔ لیکن بے حد نفیس سوٹ اور اس کے پیچھے ایک
خوبصورت سرو قامت لڑکی جو رشتے میں اسکی بیٹی ہونی چاہئے لیکن
ہوٹلوں اور ریستورانوں میں ہر لڑکی کسی کا رشتہ دار سکتا ہے۔ وہ ایک
خالی میز پر کر بیٹھ گئے ہیں۔ ان کی کرسیاں اس طرح کا زاویہ بناتی ہیں
جہاں میں بیٹھا ہوں وہاں سے دونوں کو اچھی طرح دیکھا جا سکتا ہے
اس آدمی کو تو میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن جس طبقہ سے اس کا تعلق ہے۔
اسے میں پہچانتا ہوں اس طبقہ کے سبھی لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں بس
کا لقب ایک سا ہوتا ہے کہیں ایک آدھ میں رنگ کا فرق ٹڑ جائے تو
دوسری بات ہے وہی توند۔ وہی سیاہ رنگ جو بہا پہلے ذات دی
اڑے ہوئے بال۔ ایک ہی ورسے سارے طبقے کے علاوہ بال معلوم
کئے جا سکے ہیں۔ لیکن آدمی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ اور یہ لڑکی جو
اس کی بیٹی بھی ہو سکتی ہے۔ بہن بھی بیوی بھی۔ ماں نہیں۔ کیونکہ ان سب
کی حیثیت ایک عورت کی ہے
عورت جو ایک ہی وقت میں کئی دلکش سر انجام دے سکتی ہے
اس لڑکی کو میں نے کہیں دیکھا ہے
لیکن یاد نہیں آ رہا ہے کہاں دیکھا ہے۔ ویٹر بل کی رقم لے کر
کاؤنٹر تک گیا ہے۔ میں اس لڑکی کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں میں
نے کسی گھرلے ہوئے نام یا کھوئی ہوئی صورت کو اپنے ذہن میں۔۔۔

اعصاب کی کوشش کرتا ہوں تو آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اس کا سوچنے سے کیا تعلق ہے، یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن مجھے آنکھیں بند کر کے سوچنے میں آسانی رہتی ہے۔ اس سے سوچ کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ جب ویٹر نے کاؤنٹر سے واپس آ کر چینی کی پلیٹ، جس میں کچھ ریزگاری اور باقی رقم پڑی تھی، میرے رخ پر رکھی تو میں نے آنکھیں کھولیں اور مجھے محسوس ہوا جیسے میں چنڈی گڑھ کے ایک چھوٹے سے خوبصورت ریستوران میں نہیں، اپنے شہر کے گرینڈ ہوٹل کے ہال میں بیٹھا ہوں اور میرے سامنے ایک گوری سی، دبلی پتلی لڑکی تعریف کر رہی ہے اور اس کی ناک میں پڑی لونگ کی کنی آفتاب سی کر چمک اٹھی ہے۔

"گیتا کو شک!" میں بڑبڑایا۔

"کیا سر!"

ویٹر پوچھ رہا ہے۔

"نا، کچھ نہیں تو"

میں نے پلیٹ سے نوٹ اٹھا لیے ہیں، اور ریزگاری پلیٹ ہی میں چھوڑ دی ہے۔ ویٹر نے جھک کر سلام کیا ہے اور مسکرایا ہے اور ادھر سے ایک طرف کھڑا ہو گیا ہے۔

اب میں اس خوبصورت لڑکی کی نظروں سے بچ کر ریستوران سے باہر نکل جانا چاہتا ہوں۔ لیکن جاتے ہوئے مجھے اس میز کے پاس سے ہو کر گزرنا پڑے گا جہاں ایک خاص طبقے کا مائندہ، دھوپ کے ایک ٹکڑے کو مٹھی میں دبوچ کر بیٹھا مسکرا رہا ہے لیکن جانا تو ہوگا ہی۔ میز کے پاس سے گزر رہا ہی پڑے گا۔ یہ آگ کا دریا تو پار کرنا ہی ہوگا چاہے میرا دامن اس سے جھلس جائے۔

"انکل!"
شاید اس خوبصورت لڑکی نے مجھے پکارا ہے لیکن میں نے جیسے
کچھ نہیں سنا اور اُدھورے جبر دئیے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل آیا ہوں
گریٹ لیڈی کے لئے سلام کہا ہے لیکن میں نے جواب نہیں دیا
اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے گڑھ جو ہندوستان کا ایک
خوبصورت لٹریں سٹ بہہ گیا گوشت کی آٹو گراف بک کا ایک صفحہ
سن کر میرے سامنے پھیل گیا ہے، جس پر ایک دن میں نے ایک شعر لکھا تھا
اور پھر اسے چھپانے کے لئے اپنے قلم کی ساری سیاہی انڈیل دی تھی اور جب
ریستوران سے باہر ہوا کا ایک ٹھنڈا تیز جھونکا میرے جسم سے ٹکرایا تو مجھے
محسوس ہوا اُس خوبصورت لڑکی کے ماتھے پر جھولتی ہوئی خوبصورت لٹ نے
ایک گھناؤنے گھنگھور کی طرف جیسی سفید اور دودھ جیسی اصلی دھوپ کو
سمیٹ دیا۔
میرے سامنے گورنر ڈرائیو پر چمکتی ہوئی فلورسنٹ ٹیوبز کی قطاریں
ہیں اور میرے ذہن میں مجروح نظریات کا اندھیرا ہے اور میرے ماضی کے
کھنڈر کے سے ایک آواز آ رہی ہے۔
"انکل ڈونٹ بی سلی!!!"

ایک سویا ہوا شہر

وہ کئی برسوں کے بعد ادھر آیا

جب وہ پچھلی بار یہاں آیا تھا تو یہ ایک چھوٹا سا خاموش سا اسٹیشن تھا۔ ایک ہی بازار، ایک ہی چھوٹا سا ہوٹل، لڑائی واسی سا بس اسٹینڈ۔ لیکن اب تو اس کا رنگ روپ بدل گیا تھا۔ پہلے یہ صرف ایک تحصیل کا ہیڈ کوارٹر تھا لیکن اب ہماچل کا سا پردیش بن جانے سے یہ ضلع ہیڈ کوارٹر ایک ضلع بن گیا تھا اور جیسے بن جاتے ہیں شہر کا سوشل اسٹیٹس بھی بدل گیا تھا۔ جیسے کسی دفتر میں کام کرنے والا کوئی معمولی کلرک کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھے اور ایک دم سول سروس میں آجائے یا درخت سے کہیں مجسٹریٹ لگ جائے اس کا سوشل اسٹیٹس دو دن کے ہی اندر بدل جاتا ہے آدمیوں کی طرح جگہوں کے بھی سماجی مرتبے ہوتے ہیں کوئی بہت چھوٹا کوئی صرف چھوٹا، کوئی بڑا، کوئی بہت بڑا۔ اور کوئی وی، آئی، پی لس ص

بازار سے گزری اور اس نے دکانوں پر نگاہ ڈالی اور سڑک کو پہلے سے زیادہ کشادہ اور صاف ستھرا پایا تو اُسے لگا جیسے یہ چھوٹا سا خاموش اونگھتا ہوا شہر کٹ کاری، آئی پی کے زمرے میں آچکا تھا اور اسے حیرت ہوئی تھی۔

وہ ہوٹل کے سامنے کھڑا تھا اور قلی اس کا سامان ایک طرف رکھ رہے تھے، اس نے دونوں قلیوں کو فارغ کیا اور وہ اُسے سلام کر کے چلے گئے۔ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں اور اپنے سامنے پھیلی وادی کا بھرپور جائزہ لیا۔ دوپہر ہو چکی تھی لیکن دیودار کے درختوں سے گزر کر آتی ٹھنڈک ہوا اُسے پیاری لگی۔ دھوپ کے باوجود موسم خوبصورت اور خوشگوار تھا۔ اس نے ہاتھ منہ دھو لیا۔ ہلکا ناشتہ کیا اور سو گیا۔

جب وہ جاگا تو شام ہو رہی تھی۔

اسے ایلی سے فوراً ملنا چاہیئے۔

ایلی اس کا پرانا دوست تھا اور وہ دونوں دلی میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ دراصل یہاں آنے کا اس کا مقصد اپنا ناول مکمل کرنا تھا، جو اس نے تیس سال پہلے اسکیچ کیا تھا لیکن اسے شروع کر سکا تھا لیکن ناول کا کردار ایلی ہی تو تھا۔ وہ اسی لئے یہاں آیا تھا کہ ایلی کے ساتھ ایک بار ڈسکشن کرنے کے بعد وہ فوراً ہی لکھنا شروع کر دے گا اور زیادہ سے زیادہ پندرہ دن میں وہ اُسے مکمل کر ڈالے گا۔

اس نے ایلی کو اپنے سفر کی اطلاع نہیں دی تھی۔

وہ اسے سرپرائز کرنا چاہتا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ ایلس نے یہاں ایک ٹرسٹ ڈسا رکھا تھا اور اب وہ بیچ کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس لئے اسے اطلاع دینے کی ضرورت بھی نہ تھی۔
وہ دن بھر لکھا کرے گا اور شام کو ایلس سے ملے گا اور جو کچھ لکھے گا اسے سنائے گا اور اس کی رائے لے گا پھر شام سے لے کر آدھی رات تک وہ اس کے ساتھ رہے گا۔ ولیم میوزک کا ریکارڈ دے گا۔ اس کے ساتھ ادھر ادھر گھومے گا رات کو دونوں وہسکی پئیں گے اور پھر ایلس اسے چھوڑنے اس کے ہوٹل آئے گا اور وہیں دونوں کھانا کھائیں گے اور پھر وہ واپس اپنے گھر چلا جائے گا۔
جہاں تک اسے یاد تھا ایلس کی بڑی سی شفیق اور مہربان ماں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ ایلس اگر شادی کرتا تو اسے ضرور اطلاع دیتا۔ شادی اس نے نہیں کی ہو گی یہ اندازہ اُسے ویسے ہی تھا۔
سفر کی تکان اتار لینے اور تیار ہو چکنے کے بعد وہ شام کو ایلس سے ملنے گیا۔
یہ ایک چھوٹی سی کاٹیج تھی جو شہر سے کوئی تین فرلانگ دور تھی اور اس کے نیچے ایک پہاڑی نالہ تھا اور سامنے سڑک ہی سرسبز پہاڑیاں تھیں ایلس کو یہ جگہ بہت ہی پسند تھی جب وہ پچھلی بار یہاں آیا تھا تو اسے بھی یہ جگہ پسند آئی تھی۔

اس نے دروازے پر دستک دی
کوئی رسپانس نہیں ملا
اس نے دوبارہ دستک دی
اب کی بھی کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا

اس لئے اس نے رک کر ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔
تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا
اس کے سامنے ایک کیب سی لڑکی خاتون کھڑی تھی جس کے بال ایک دم سفید تھے اور سب کم بھی ہو گئے تھے یہ ایلی کی ماں تھی لیکن کتنی سالی ہوئی تھی۔
"گڈ ایوننگ مدر"
"گڈ ایوننگ" خاتون نے بڑی آہستگی سے جواب دیا
"ایلی گھر میں ہے؟"
"نہیں یہاں نہیں"
"تو کہاں ہے وہ؟ میں اس کا مرید مخلص ہوں"
"کم ان سن"
وہ خاتون کے پیچھے پیچھے کاٹیج میں داخل ہو گیا اور سوچنے لگا کیا ایلی نے شادی کر لی تھی اور وہ ماں سے الگ ہو گیا لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا۔ ماں کے لئے جان دیتا تھا۔ اُسے وہ اس حالت میں کبھی نہ چھوڑ سکتا۔
وہ اندر آکر صوفے پر بیٹھ گیا
صوفہ وہی تھا جس پر وہ بیس برس پہلے بیٹھا تھا لیکن اب بہت پرانا اور بے رنگ ہو گیا تھا
"ایلی کہاں ہے مدر!"
"مائی ڈارلنگ" ماں نے دیوار کے ساتھ لگے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈا" وہ چیخا۔
"ہاں۔ ایک ایکسی ڈنٹ میں"
"کب؟"
"پانچ سال ہو گئے"
یہ سن کر اس کی جان ہی تو نکل گئی۔
"ویری سیڈ ہور"
"مجھے یہی چاہتا تھا" ماں بولی۔
وہ کچھ دیر اپنے آپ کو اس بدلے ہوئے ماحول میں فٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کچھ نہیں بولا۔ ماں بھی خاموش تھی اور انگلیوں کو بار بار دبا رہی تھی۔ جیسے اسے ایسا کرنے سے سکون مل رہا ہو۔
"میں نے کاٹیج کا آدھا حصہ کرایہ پر دے رکھا ہے۔ لو سوسائٹی کم"
پھر اس نے آہستہ سے کہا۔
"اور وہ آرچیٹ؟"
"وہ ایلن نے بیچ دیا تھا۔"
اس کے بعد وہ پھر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔
"مسٹر ریو ایلن کا بہت پرانا دوست ہوں۔ میں ایک بار یہاں آیا بھی تھا"
ایلن اور میں دہلی میں اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔"
"میری یاد داشت کمزور ہو گئی ہے۔ آئی ایم سوری" ماں نے مسکرانے کی کوشش کی۔
"ایلن بڑا گریٹ آدمی تھا"

سارا شہر اکٹھا ہو رہا ہے۔ ماں نے مجھے نیا سوٹ سلا کر دیا ہے
کل تمام دن وہ کیک اور مٹھائیاں بناتی رہی ہے۔ دیکھو یہ لڑکی کتنی سویٹ
ہے۔ یہ مجھے پیار کرتی ہے۔ اس کا نام جوزیفین ہے۔ یہ جو ٹائی میں نے لگا رکھی
ہے یہ اسی نے پریزیڈنٹ کی ہے مجھے۔ یہ کچھ دنوں کے لئے اپنے اسکول کے
پاس حربی حال میں ہے۔

یہ ہیں سینٹ سٹیفن کالج دہلی کے میرے دوست۔ ماں میں سے ان
سوں کو تم کبھی پہچان سکتے ہو۔ یہ نرتم ہے۔ آج کل سالا کمیونسٹ لیڈر
بن گیا ہے۔ یہ رساتساں ہے جس کی تصویریں اب نمائش میں دکھائی جاتی ہیں
یہ مریم ہے جسے میں پیار کرتا ہوں۔ جمد نیں کی جگہ اب مریم نے لے لی ہے۔
اور یہ تم سب ہو ایک دم گھوڑوں کی طرح کے کرے جا رہے ہیں کثرے اشلیکی ل
سے کی کوشش کرتے ہو۔ قہقہہ سا ہے تا میرا ایسا ہی تمہیں لگاتا
رہا ہوں یہاں پر ہر شام کو کافی ہاؤس میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو گالیاں
دیتے ہیں، اور ٹھنڈے پانی کے گلاس خالی کرتے رہتے ہیں ۔۔۔

"مریم کے باپ نے آج مجھے مریم سے ملنے کو منع کر دیا ہے۔ میرا باپ زندہ
نہیں ہے۔ وہ اسی لڑکی کو ایک ماڈرن لڑکے سے ہی بیاہ سکتا۔ آئی
کانٹ گٹ اِٹ اے فادر ناؤ۔ میری آنکھوں میں آنسو ہیں اور میری آواز درد میں
ہوئی ہے۔ کیونکہ آج مریم کے فادر نے میری انسلٹ کی ہے۔

میں اب واپس گھر جا رہا ہوں۔ تم سب لوگ مجھے چھوڑنے آئے ہو دہلی
اسٹیشن پر۔ تم اب واپس چلے جاؤ۔ گاڑی اگر ٹھیک وقت پر بھی چلی تو بھی گیارہ
بج جائیں گے۔ میں اسکول لینڈ لیڈی پر پری کی دیکھ بھال کروں گا۔ اور پھر
ملکوں پہ ... دوں گا۔ مجھے کسی بھی مارکس کے سلوگن میں، عقیدہ نہیں۔

ایلس کی آواز مدھم ہوتے ہوتے آخر ختم ہو گئی تھی۔

اسی لمحہ ماں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چائے کی ٹرے تھامے اندر داخل ہوئی۔

"سوزی کس قدر دلیر ہو گئی تھی"

وہ کچھ نہیں بولا۔ الفاظ اس کے حلق میں ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔ اور وہ ابھی سمیٹ نہیں پایا تھا۔ اس نے صوفے سے اٹھ کر چائے کی ٹرے ماں کے ہاتھوں سے لے کر میز پر رکھ دی۔

"میں بناتا ہوں چائے" اس نے اپنے کھدر کے کرتے کی آستین ہی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

"ارے تم رو رہے ہو میرے بچے" ماں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا اور وہ پھپک کر رو پڑا۔

"ہاں! آئی ایم لیٹ ممی! میں چاہتا تھا میں اپنا ناول یہاں آ کر مکمل کروں"

"تم ہی اس کے ماسٹر پیس ہو۔ اب مجھے یاد آ گیا"

"لیکن میں نے بہت جلدی نے دیری کی ہے۔ میں وقت سے پہلے نہیں آیا"

"وہ تمہیں بہت یاد کرتا تھا۔ ایکسیڈینٹ کے بعد اسپتال میں وہ تمہیں اور سوزی کو یاد کرتا رہا۔ مجھے تم دونوں میں سے کسی کا ایڈریس معلوم نہیں تھا اور پھر وہ آخری ہچکی لے کر خدا کے پاس چلا گیا"

یہ کہتے ہوئے ماں اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور اس کے ناول کا البم اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔

"میں بڑی اذیت میں ہوں ممی"

"تم جانتے ہو میرے بچے۔
ماں آپ نہیں پیتیں گی؟"
"نہیں۔ میں شام کو کچھ نہیں لیتی۔ ایلن کی موت کے بعد میرا یہی دستور ہو گیا ہے۔"
"اس لیے ماں کو مجبور نہیں کیا۔ اور دھیرے دھیرے چائے پیتا رہا۔ ماں کو چائے بنانے سے خاصا اسٹرین ہوا تھا۔ اس نے صوفے کے ساتھ پیٹھ لگا دی تھی اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے ان کی آنکھ لگ گئی تھی۔
کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ اس نے پلنگ پر پڑی ہوئی شال اٹھا کر بڑی آہستہ سے ماں کے گھٹنوں پر ڈال دی اور کچھ لمحے اسے اسی طرح سکون سے آنکھیں بند کیے صوفے سے پیٹھ لگائے دیکھتا رہا۔ اور پھر کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھول کر باہر آ گیا۔ اس نے سامنے کا گیٹ بڑی آہستگی سے بند کیا اور پھر گیٹ کے سامنے رک کر اپنے سینے پر دائیں ہاتھ سے کراس کا نشان بنایا اور اسی سڑک پر واپس ہو لیا جو اس کے ہوٹل کو جاتی تھی۔
اس ناول کو اب جو سامنے ہوا پیش کروں گا ایلن تمہارے لئے تو میرا تمام فریم ورک ہی اکھڑ دیا ظالم! تمہارا گھر تو ایک سویا ہوا خاموش شہر ہے جس میں ہر چیز قرینے سے رکھی ہے۔ لیکن گلیاں، بازار، گھر جس سنسان ہیں ایک شخص بھی نہیں انہیں دیکھنے والا اور شہر کی فصیل کے بڑے سے دروازے کے سہارے تمہاری ماں بیٹھی ٹیک لگائے ایک پہرے دار کی طرح دن رات کھڑی ہے اور اب وہیں کھڑے کھڑے پتھر ہو گئی ہے۔

وہ اپنے تہہ تک کے کمرے میں کھڑا اس تمام کاغذات کو پھاڑ کے
ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا جس پر وہ اپنے ناول کا اسکیچ تیار کرتا رہا تھا۔
اور دھیرے دھیرے بڑبڑا رہا تھا اور پھر اسے کاغذ کے ایک ایک ٹکڑے
کو کمرے کی کھڑکی سے باہر نیچے پھیلی عمیق گہرائی میں پھینکنا شروع کر دیا

ڈیڈ لیٹر

آج کی ڈاک میں صرف ایک لفافہ تھا۔ بیرنگ لفافہ ہونے کے
لئے اسے پاس پیسے دینے پڑے۔ بیرنگ لفافے وہ ہمیشہ لوٹا دیا کرتا
تھا اور بھیجنے والے کی تحریر پہچاننے کی کوشش نہ کرتا تھا۔ یہ اس کی عادت
تھی۔ لیکن یہ لفافہ وہ جانے کیوں واپس نہ کر سکا۔ جب سے نئے پیسوں
والا سلسلہ شروع ہوا تھا اس نے رقموں کا حساب کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔
اس کے باوجود ہزار کوشش کے آنوں کے نئے پیسے اور نئے پیسوں کو آنوں میں
بدلنے کا صحیح طریقہ نہیں آیا تھا۔ اس معاملے میں وہ ہمیشہ مغالطہ کرتا
تھا۔ لین دین کے سلسلے میں یا تو پیسے کم ہوتے یا زیادہ۔ اس نے سوائے
پچیس اور پچاس نئے پیسوں کے کبھی ٹھیک حساب کتاب نہ کیا تھا۔ عام
طور پر ان پیسوں کے لئے آخر اس نے ایک نیا طریقہ اختیار کر لیا تھا وہ
ہمیشہ روپے کا نوٹ دیتا اور واپس ملی ریزگاری کو کبھی نہ گنتا۔ اس سے

کھڑا رہا اور پھر ہاتھ سے کرسی کو ٹٹولتے ہوئے بیٹھ گیا جیسے وہ لڑکھڑانے لگا تھا اور اس خیال سے کہ کہیں وہ گر نہ جائے، اپنے آپ کو سنبھال رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے اپنا ماتھا میز سے ٹیک دیا اور پھر جانے کیوں اس کی ویران آنکھوں میں ایک بھرپور طوفان امڈ آیا آنسو اس کے سنہری پپوٹوں سے رسنے لگے۔ وہ دھیرے دھیرے سسکنے لگا اور اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خالی صفحے اس کے آنسوؤں سے بھیگنے لگے۔ جیسے ایک ہموار چٹیل میدان پر کوئی گھٹا اچانک کھل کر برس جائے کچھ لمحے اور گزر گئے اور پھر اس چٹیل میدان پر دھوپ بکھر آئی اور اس کی یادوں کے دریچے کھل گئے اور ایک یاد پھول کے کچے کانٹے کی طرح اس کی ہتھیلی میں چبھ گئی اسے لگا جیسے اس کی آنکھوں سے خون کی ایک بوند ٹپکی تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک سرخ شگفتہ پھول بن گئی تھی۔

ایک یاد دھواں ہو گئی تھی

ایک پھول مہک اٹھا تھا

ایک چمن لہلہا گیا تھا۔

سات برس پہلے کی بات تھی

رسا کو اس روز جانا تھا۔ اس کی ماں اسے لینے آئی تھی۔ وہ پچھلے ایک برس سے اپنے ماموں کے ہاں آئی ہوئی تھی بی، ایڈ کی ٹریننگ لینے یہاں اسے داخلہ آسانی سے مل گیا تھا۔ اس لئے کہ اس کے ماموں ٹریننگ کالج میں ہی پروفیسر تھے اور انہوں نے ہی مشورہ دیا تھا کہ وہ بی، ایڈ کر لے رسا بی، اے کا امتحان دینے کے بعد اپنے ماموں کے پاس ایک ڈیڑھ مہینے کے لئے آئی تھی لیکن رزلٹ کے بعد واپس نہ گئی تھی اور اس نے

سہیلی ٹریننگ کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اس کا سامان ایک بار اس کی ماں
جب دہلی گئی تھی تو ساتھ لے آئی تھی اور رسا کو پھر گھر جانے کی ضرورت ہی محسوس
نہ ہوئی تھی۔ پھر وہ ٹریننگ کے چکر میں ایسی الجھی کہ سال بھر سوائے ایسے
ایجوکیشنل ٹور کے کہیں بھی نہ گئی تھی۔ یا پھر ایک بار کچھ دنوں کے لئے اپنی ایک
سہیلی کے ساتھ مسوری گئی تھی ورنہ سال بھر کا تمام عرصہ اس نے اسی چھوٹے
سے شہر میں گزار دیا تھا، کالج کے اسٹاف کوارٹرز میں جس کے کمرے
کوئی خاص اچھے یا وسیع نہیں تھے۔ پہلا کوارٹر جنید رسا کا تھا اور دوسرا کوارٹر
رسا کے ماموں کا۔ جنید رسا اور اس کی ماں یہی تھا ان کا کل خاندان
بڑا وسیع لیکن بہت ہی مختصر۔ اس کی ماں کے کہنے کے مطابق ایک بہت بڑے
محل کی اب صرف دو ہی اینٹیں باقی رہ گئی تھیں۔ محل ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔
ایک بہت بڑا قافلہ تھا لیکن دھیرے دھیرے سبھی بکھیر دیکھے تھے اور اب
صرف دو ہی مسافر باقی تھے اور جانے منزل پر پہنچنے تک دو بھی رہیں گے
کہ نہیں۔

جنید نے رسا کو پہلی بار جب دیکھا تھا جب وہ رکتا ہے اگر کہیں
ماموں پروفیسر کشتی کا کوارٹر پوچھتے پوچھتے اس کے گھر آ گئی تھی۔
"شاید میں غلط جگہ آ گئی" اس نے کہا تھا اور گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ
سے اس کے ماتھے پر پسینہ ابھر آیا تھا اس نے ڈھلکتا ہوا آنچل سنبھالا تھا
اور واپس مڑنے لگی تھی۔
"جگہیں غلط نہیں ہوتیں، یہاں غلط ہوتے ہیں" جنید نے جواب
دیا تھا اور رسا اور بھی زیادہ گھبرا گئی تھی اور پلٹ کر دروازے تک پہنچ
گئی تھی۔

ہوگی، پہاڑوں پر چھائی گھٹاؤں نے ایک دھندلکا سا پھیلا دیا ہوگا اور وہ کسی موڑ پر کھڑا رسا کی پرچھائیں کو دیکھ رہا ہوگا۔ پرچھائیں صرف دیکھی ہی جا سکتی ہیں پکڑی نہیں جا سکتیں۔ پرچھائیں جن کا وجود صرف روشنی سے ہوتا ہے۔ اگر روشنی نہ ہو تو تمام کائنات ایک بہت بڑی پرچھائیں بن جاتی ہے۔ جسے نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ چھوا جا سکتا ہے جو ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس کی ہستی کو اندھیرے میں تحلیل کر دیتی ہے

حشمدر کو اندھیرا اس لئے پسند تھا کہ اس میں وہ اپنے آپ کو آسانی سے تحلیل کر سکتا تھا۔ اس میں اپنی ذات کو جذب کر سکتا تھا۔ اسی لئے وہ کمرے کی کھڑکیاں بند کر لیتا تھا۔ دروازوں پر موٹے موٹے پردے لٹکا دیتا تھا۔ ان کی اس عادت سے اس کی ماں کئی بار کھیج اٹھی تھی۔

"یہ کیا فرعونی حالت بنا رکھی ہے تم نے کمرے کی؟"

وہ اپنی ان پڑھ بوڑھی ماں کو کوئی جواب نہ دیتا تھا کیونکہ وہ کوئی ایسا سیدھا سادا جواب نہ دے سکتا تھا جسے اس کی ماں سمجھ سکتی اور مطمئن ہو جاتی۔ وہ ماں کی بات سن کر صرف مسکرا دیتا اور جامد رہتا۔

ان سرمئی گھٹاؤں میں رسا اس کے کمرے کے قبر جیسے ماحول میں داخل ہوئی تھی۔ ساکسی ہلکی سی آہٹ کے بھی ایکدم جامد، غیر محسوس طور پر، اچانک بھاری پردے سے ڈھکے ہوئے دروازے سے، حشمدر کی طرف پیٹھ تھی

حشمدر نے اپنے کندھوں پر دو جانے پہچانے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا اور کتاب سے نظریں اٹھا کر پیچھے کی طرف گھوما اور رسا

کے بکھرے ہوئے نیم گیلے بال اس کے چہرے پر لہرا گئے۔ دھندلکا اور بھی
گہرا ہو گیا

"تم گھٹا بن کر آئی ہو یا دھوپ بن کر؟"

"ہوا کا ایک جھونکا بن کر"

اور پھر رسا نے اپنی ٹھوڑی ستیندر کے بائیں کندھے پر ٹکا دی
اور ستیندر نے اپنا چہرہ اس کے لمبے سیاہ گیسوؤں میں چھپا لیا تھا۔ اسے
لگا تھا جیسے پہاڑ کی کسی اونچی چوٹی پر ایک بوجھل گھٹا نے اسے اپنی
آغوش میں لے لیا تھا۔ رسا کے گیلے بالوں کی ہلکی سی خوشبو اس کے
دماغ میں لہرا گئی۔

"گھٹا اور دھوپ میں ایک اِستھرتا ہے جو جھونکے میں نہیں۔"
اس نے کہا تھا

"جھونکے کی استھرتا ہی اس کی جان ہے۔"

"رسا کاش میری زندگی کا یہ جھروکا جو تم نے کھول دیا ہے قیامت
تک کھلا رہے اور تم خوشبو سے لدے ہوئے ایک جھونکے کی طرح آتی
رہو اور اپنے ساتھ لاتی رہو یادوں کے وہ قافلے جن کے نقوش کو منزلیں
سلام کرتی رہیں، صبح اور شام، لب اور دل۔"

"تم اپنا یہ جھروکا بند کر نا، جھونکے آتے رہیں گے۔"

اور پھر ستیندر نے کرسی سے اٹھ کر رسا کو اپنے بازوؤں میں کھینچ
لیا تھا اور رسا کا دل اس طرح دھڑکا تھا جیسے چاندنی کرنیں کسی
بند دریچے پر دستک دے رہی ہوں۔
تھوڑی دیر بعد رسا چلی گئی۔

جانے سے پہلے اس نے حتیندر کے لمبے چمک دار بالوں کو اپنی خوبصورت گوری انگلیوں سے پکڑ کر ہولے سے کھینچا تھا، پھر انہیں بکھرا دیا تھا، پھر چوم لیا تھا۔ جب تک میں واپس نہ آؤں ہر شام ان بالوں کو خود ہی بکھرا دیا کرنا میں وہیں سے چوم لیا کروں گی۔"

اور پھر رسا ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی تھی اور حتیندر وہیں کھڑا اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس نے رسا اس کی ماں سے کہہ رہی تھی "جا کہاں رہی ہوں، تھوڑے ہی دنوں میں واپس آ رہی ہوں ماں جی، ماسٹر جی خود سا ہے مجھے۔"

اس کا تصور رسا کی آواز کا آنچل تھامے اسے اس کے گھر تک چھوڑ کر واپس نہیں آیا وہیں منڈلاتا رہا۔ اس کے ارد گرد، آس پاس، دیواروں اور دروازوں پر۔

رات کی گاڑی سے رسا چلی گئی۔ وہ پھر اسے ملنے نہیں آئی۔ وہ اسٹیشن پر اسے سی آف کرنے نہیں گیا اس نے اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہی تانگے کے آنے، تھوڑی دیر رکنے، سامان رکھنے اور اسٹیشن کی طرف روانہ ہونے کا منظر دیکھا اور رسا کی یادوں کی چادر اوڑھ کر سو گیا۔

بارش مسلسل ہوتی رہی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے رہے۔

تیسرے دن حتیندر کو ہلکے گلابی رنگ کا ایک بند لفافہ ملا۔ آر ایم ایس کی مہر تھی۔ لفافہ ٹھاکور ریلوے اسٹیشن سے پوسٹ کیا گیا تھا۔ رسا رات بھر لکھتی رہی تھی۔ رائیٹنگ پیڈ کے پورے سولہ صفحے۔ اس کے پاس ٹکٹیں نہیں تھیں اس لئے اس نے لفافہ بغیر ٹکٹوں کے ہی پوسٹ کر دیا تھا۔ کئی ایک ہی خط لکھا رسا نے، وہ بھی اس سیمنٹ سے وہ عاری تھی جتیلے

کو تو خط کی سطریں زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ وہ تو یہاں تک بتا سکتا تھا اگر کوئی سا صفحہ کس سطر سے شروع ہوتا تھا۔ یہ خط اس کی کائنات بن گئی تھی آج کا سرنگ لعابہ وصول کر لے کے لعد وہ ان سیاٹ کورے صفحوں کو آنسوؤں سے کھگوتا رہا اور اسے یاد آنے لگیں وہ باتیں جو آج سے سات برس پہلے رسناتے اُسے لکھی تھیں تمام رات کا بڑی بلی جاگ کر مضمون کی ترتیب اور تحریر کا تاسب لو اسے یاد نہیں رہا تھا ویسے اسے ایک ایک لفظ یاد تھا۔ اسے آنسوؤں کے پھیلے ہوئے وہ دائرے یاد تھے جنہوں نے مضمون پر بکھر کر لفظوں کو نگار ڈالا تھا وہ ایسے انگار تھے جو پھولوں کی پنکھڑیوں سے برستے تھے وہ آج بھی محفوظ تھے اس کی یادداشت میں اور اب جیسے جھولی بھر انگارے ٹھکا دیئے تھے کسی نے اس کے ذہن پر۔

"حال بہت گہری نیند سورہی ہے لیکن میری آنکھوں کے بیوتے زخموں کی طرح کھلے ہیں۔ ان میں بید کی لہریں نہیں درد کے شعلے ہیں جو جھلے جارہے ہیں۔ سوچتی ہوں ان کھلے زخموں کے دونوں سے ان پگڈنڈیوں کو ایک بار پھر کر دیکھ لوں جن پر ہم دونوں ایک ساتھ چلے ہیں۔ وہ پگڈنڈیاں ہی ہیں شاہراہیں نہیں۔ محبت میں شاید شاہراہیں ہوتی ہی نہیں، صرف محدود سی پگڈنڈیاں ہوتی ہیں۔ تلوار کی دھار کی طرح مہین۔ ذرا چوک ہوئی تو پاؤں کٹ گئے۔ اور جب پاؤں کٹ جائیں تو راستوں اور منزلوں کی آہٹ ہی کیا رہ جاتی ہے

تمہیں یاد ہے جب میں پہلے ہی روز غلطی سے تمہارے کوارٹر میں داخل ہو گئی تھی۔

"راستا اندھیرے میں غلط جگہ آ گئی" ، میں نے کہا تھا۔
"جگہیں غلط نہیں ہوتیں۔ ہمیں غلط ہوتے ہیں" ، تم نے جواب دیا تھا۔

میری تمہاری پہلی گفتگو ہی ہمارا اصلی پریچے تھا ، یہی حال ہمارا حقیقی تعارف۔ تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جگہیں غلط نہیں ہوتیں ، ہم ہی غلط ہوتے ہیں۔ میں غلطی سے ٹھیک جگہ پہنچ گئی تھی۔ اب سوچتی ہوں تو اتفاقات کی اہمیت کا یقین ہو جاتا ہے۔ اس روز اگر میں تمہاری دہلیز پار کر کے گھر کے اندر نہ جاتی تو شاید وہ دہلیز کبھی پار نہ ہوتی۔

ایک دن تم میرے بالوں کی تعریف کر رہے تھے۔ کیا واقعی اسے تعریف سمجھنا چاہیئے؟ آج سوچ رہی ہوں یہ بات ، گھر میں اوپر والی کرسی پہ بیٹھی جبکہ کیبائنٹ کی چھت سے پنکھے کی ہوا میرے لئے مصیبت بنی ہوئی ہے بال بار بار اڑ کر تمام چہرے کو ڈھانپ لیتے ہیں اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔
تم نے کیا کہا تھا ایک دن۔
"اگر تم اپنے بال کھول کر کسی کے راستے میں بکھرا دو تو اتنا گھپ اندھیر ہو جائے کہ چلنے والا ضرور کا بھٹک جائے گا"
"کہاں جائے گا بھٹک کر آخر؟" میں نے پوچھا تھا۔
"کہاں جا سکتا ہے بے چارہ ، پھر کر اسی راستے پر لوٹ آئے گا۔"

اور ایک بار تم نے کہا تھا۔
"تم اپنے بالوں کی ایک لٹ سے کم سے کم ایک درجن آدمیوں کو پھانسی

یہ رابطہ رکھ سکو۔
میں نے گھبرا کر کہا تھا۔
۔ باپ رے بیاقسی،
سر بالا اٹھا کر دیکھو تو، تم نے جواب دیا تھا
اور میرے اچھے بھلے سنورے ہوئے بالوں کو کھول کر تم نے اپنی گردن
کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ در اصل اس طرح سدھ ہو گئی تھی تمہارے ساتھ جیسے اب
کبھی الگ نہ ہو سکوں گی جیسے ہم دونوں ہی پھانسی کے تختے پر کھڑے تھے
تمہارے ساتھ پھانسی کے تختے پر کھڑے ابھرا تھا یہی خوش قسمتی ہی سمجھو کہ
اس طرح چھیڑیں گھورتے رہتے تھے تم جیسے کلاس میں لڑکیاں مجھ پر
طعنے کسا کرتی تھیں۔ کبھی شیلی میرا تمہارا کوئی پیار کا سمبندھ ہے، کسی پچھلے
جنم کا۔ اور میں سوچتی ہوں اگر اس جنم کے رشتے قائم نہیں رہ سکتے تو پچھلے
جنموں کے رشتے کہاں قائم رہ سکتے ہوں گے۔ لیکن ہم جو ہر ملی میں وشواس
رکھتے ہیں اپنی محرومیوں کے درد کو ٹالنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ
کر لیتے ہیں۔
تم اچھے ہو کہ بات میں وشواس رکھتے ہی نہیں، صرف سندرتا
اور سچائی میں لیکن سچائی سندر نہیں ہوتی۔ کم سے کم لوگ اسے سندر
نہیں سمجھتے۔ کیونکہ تم ضرورت سے زیادہ صاف گو ہو اس لئے بہت
سے لوگ تمہیں پسند نہیں کرتے۔ در اصل وہ تم سے جلتے ہیں۔ دل ہی دل
میں اپنے آپ کو تم سے ہیچ محسوس کرتے ہیں اور کمتری کے اسی احساس
کو چھپانے کے لئے تمہاری مخالفت کرتے ہیں اور برائیاں گھڑتے ہیں۔ عورتیں
میری ماں تمہیں پسند نہیں کرتی۔ آج صبح ہی جھگڑا ہو گیا تھا ہمارا۔ تم ہیں جا
میں اب تک بھوکی ہوں۔ صبح سے کچھ بھی تو نہیں کھایا۔ تمہارا ذکر آ گیا تھا اور

میں نے تمہاری تعریف کر دی تھی اس پر حرفگہ گئے تھے سب لوگ مس ایسا
دکھا کہ بس روکی ہی رہی۔ سوچا تھا کہ اور یہیں حسام کو جائے کی پیالی تو
تمہارے ساتھ پی سکوں گی لیکن جائے تو جائے پانی تک نصیب نہیں ہوا
حلق میں کانٹے چبھ رہے ہیں۔
تم نے ایک بار کہا تھا۔
زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب انسان خود اپنے آپ
سے نفرت کرنے لگتا ہے۔
کیا سچ مچ آتا ہے کبھی ایسا وقت کہ تم نے یونہی کہہ دی تھی یہ بات؟
اس سے جانے کیوں مجھے تمہاری تلخ بات یاد آرہی ہے جب کہ اسے
لے کا کوئی موقع نہیں۔
کبھی بوڑھی یا دآنے لگتی ہیں باہر ہیں سا کسی سگار کے ایسے ہی آپ سے
آپ
گاڑی کی رفتار دھیمی ہو گئی ہے۔ شاید کوئی اسٹیشن آنے والا ہے میں
نے قلم روک دیا ہے۔
وہ آگیا اسٹیشن
پلیٹ فارم پر جیسے حکا جو ہد سو رہی ہے۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے
میلہ بھر رہا ہو
بیٹھے بیٹھے پیٹھ بھی اکڑ گئی ہے۔
پل بھر ستا لوں۔
پیاس سو روپے ناحق اتنے روپیے خرچ کر ڈالے۔
تمہیں تو معلوم تھا میں قیمتی ساڑیاں نہیں پہنتی۔ اس قسم کی ساڑیاں

تو کہیں بیاہ شادیوں میں ہی پہنی جاتی ہیں۔ عام استعمال میں کہاں آتی
ہیں ایسی چیزیں۔ اب یہ ساڑھی میرے ٹرنک میں پڑی رہے گی اور
میں کسی ایسے موقع کا انتظار کرتی رہوں گی جب اسے استعمال کرسکوں
لیکن تم اتنے جذباتی کیوں ہو رہے تھے تب ؟
میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو کوئی اپہار دیا ہے۔ دل میں اس
شرارت کی چاہ کبھی ابھری ہی نہیں کہ کسی کو کچھ پیش کرسکوں۔ تم انکار کرو گی تو
مجھے دکھ ہوگا۔
میں انکار نہیں کر رہی، بلکہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھ رہی ہوں
یہ سوچنا میرا کام ہے تمہارا نہیں، تم نے جواب دیا تھا۔
میں نے ساڑھی لیتے ہوئے جن نگاہوں سے تمہیں دیکھا تھا اسے
زندگی میں کسی اور کو ان نگاہوں سے دیکھ سکوں گی، اس کا مجھے یقین
نہیں۔ میں تمہیں فریب نہیں دے رہی۔ اپنے دل کی بھاؤنائیں تمہارے
سامنے رکھ رہی ہوں۔
ہاں ماں جی کا خیال رکھا کرو۔ وہ تمہاری خاطر بے حد پریشان رہتی
ہیں۔ اب واقعی تمہیں شادی کر لینی چاہئے۔ میں واپس آجاؤں۔ تو دونوں
مل کر اس مسئلہ پر سوچیں گے۔ تم اکیلے سوچو گے تو کوئی فیصلہ نہیں کر
پاؤ گے لیکن ماں جی کو تسلی دو کہ تم نے اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنا
شروع کر دیا ہے۔
جس دن میرا پریکٹس آف ٹیچنگ کا امتحان تھا تم کتنے بے چین
تھے جب میں امتحان سے پہلے تمہیں ملنے گئی تو تم نے بڑی بے قراری سے
میری طرف دیکھا۔ میری ساڑھی کے بل درست کئے۔ میرے بالوں

میں ہیر پر ٹھیک سے لگائے۔ جوڑے کو سوارا۔ کریم کا ایک چھوٹا سا دررہ اوپر والے ہونٹ کے ایک کونے پر جارہ گیا تھا، اسے رومال سے لے لیا۔

وہ چارٹ جو مجھے امتحان کے وقت لطور ٹیچنگ ایڈز استعمال کرنے تھے، ایک بار غور سے دیکھے تھے، جس ترتیب سے انہیں استعمال کرنا تھا اسے درست کیا اور جب میں جانے لگی تو میرے منہ میں مصری کی ڈلی ڈال دی جو جانے کب تک میرے منہ میں گھلتی رہی"۔

تم کتنے اچھے ہو، کبھی کبھی تو تمہیں اتنا اچھا دیکھ کر ڈر لگنے لگتا ہے اور برنارڈ شا کے وہ الفاظ یاد آنے لگتے ہیں جو اس نے مہاتما گاندھی کی موت پر کہے تھے۔

This shows how dangerous it is to be too good.

ایک برس تمہارے قریب رہ کر جو کچھ میں نے پایا ہے اسے ساری زندگی بھی کھوتی رہوں تو بھی ختم نہ ہوگا۔ بہت کچھ دیا ہے تم نے میری تمام شخصیت کو مالا مال کر دیا ہے۔ تم نے ایک بھکارن کو قارون کا خزانہ عطا کر دیا ہے۔ حقیقتاً۔

آج پہلی بار تمہارا نام لے رہی۔۔ ہوں۔ اس گستاخی کے لئے مجھے معاف کر دینا۔ لیکن یہ اس جذبے کا رد عمل ہے جو ایک پجارن کے دل میں اپنے دیوتا کے لئے ہوتا ہے ایک پجارن اپنے دیوتا کو اس بے تکلفی سے مخاطب کر سکتی ہے کیونکہ یہ اس کا نجی اور ذاتی معاملہ ہے جس کے لئے اسے کوئی نہیں ٹوک سکتا۔ خود دیوتا بھی نہیں۔

کتنے ہی اسٹیشن نکل گئے ہیں۔

آنسو بہہ جاتے۔ ہفتہ بھر کے بعد تو اس کا صبر ٹوٹ گیا۔ وہ کالج جانے سے پہلے ڈاک گھر جاتا۔ اپنی ڈاک پوچھتا کئی خط ہوتے جنہیں وہ کھولتا تک نہ تھا۔ لیکن رسما کی طرف سے ایک سطر بھی اس تک نہ پہنچی۔ جب صبر کی حدیں ٹوٹ گئیں تو اس نے خود ایک خط لکھا۔ بڑا ہی مختصر لیکن درد سے بھرپور۔ وہ اسے پوسٹ کرنے لگا ہی تھا کہ پروفیسر کشی مل گئے۔

"رسما کی شادی ہو گئی" انہوں نے چھوٹتے ہی کہا

"شادی" اتیندر کے پاؤں تلے کی ریتیں نکل گئیں۔

"ہمیں آج الوپی ٹش کا کارڈ ملا ہے۔ حسکہ کل رات بارات بھی آ چکی، پھیرے بھی ہو چکے۔ جانے کیا سوجھی ان لوگوں کو"

"ویری اسٹرینج" اتیندر کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا

"رسما کی ماں کو بھی خبر نہیں۔ اب جا کر کارڈ دکھاؤں گا کارڈ بھی کالج کے ایڈریس پر بھیجا ہے" پروفیسر کشی نے جیب سے کارڈ نکالی کر اتیندر کے سامنے کیا لیکن اتیندر نے لفافہ کھولا نہیں، ویسے ہی واپس کر دیا۔

"ایکسکیوز می" وہ یہ کہہ کر آگے نکل گیا۔

کچھ دور جانے کے بعد اس نے رسما کے نام لکھا ہوا خط جیب سے نکالا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے سڑک پر بکھیر دیا تاکہ ہر راہ گیر ان ٹکڑوں کو روندتا ہوا چلا جائے۔ اس کے ان سپنوں کو جو اس نے سنگ کا جل دے دیکھ جوان کئے تھے۔

اس رات وہ ایک پل بھی نہ سویا۔

رات کا ایک ایک لمحہ جیسے اس کی شاہ رگ کو کاٹتا ہوا گزرا تھا اور رات

کا داس اس کے حواس سے کھیل رہا تھا۔ اور اس کی زندگی میں اب کچھ بھی نہ بچا تھا تمام رات جیسے آگ جلتی رہی تھی اور اس کے ماضی کا ایک ایک پل سلگتا رہا تھا اور اب ہر طرف راکھ تھی اور حواس تھا اور کھنڈر تھے۔
اگلی صبح جب وہ بستر سے اٹھا تو اس کی ماں بھی اسے پہچان نہ پائی تھی
"رات تم کہاں چلے گئے تھے؟"
"اپنے کمرے میں تھا، ماں"۔ ایک صرف ماں تھی جس سے وہ سیدھی سادی اور عام سی باتیں کرتا تھا۔ تاکہ اسے کوئی الجھن نہ ہو
"تم پہچانے بھی نہیں جاتے"
"تمہاری آنکھیں کمزور ہو گئی ہوں گی۔ کل ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا"
اس نے دھیرے سے ہنستے ہوئے کہا اس روز وہ کالج بھی نہیں گیا ویسے ہی سائیکل سواری کر گھومتا رہا اور شام کو گھر لوٹ آیا گھر آیا تو اسے لگا جیسے وہ اپنے گھر نہیں کسی غیر کے گھر آ گیا ہے جہاں اسے کوئی نہیں پہچانتا۔ کوئی اس کی طرف نہیں دیکھتا جس کمرے کی کھڑکی کھول کر کبھی کبھی رسا کو دیکھا کرتا تھا اس میں اس نے کیل گاڑ دیئے شام کو وہ یہی کام کرتا رہا۔ ماں حیران تھی لیکن خاموش تھی کھڑکی تو وہ اسے ویسے بھی نہیں تھی۔ لیکن اب تو بات ہی الگ تھی
کئی روز گذر گئے۔
ایک روز پروفیسر بخشی نے بتایا کہ رسا پیرو لی چلی گئی تھی جہاں اس کے خاوند کا سائیکلوں کا کاروبار تھا۔ شادی جو کہ اچانک ہی طے ہو گئی تھی اس لئے رسا کے والد کسی کو بھی وقت سے اطلاع نہ دے سکے تھے اس قسم کا کوئی خط آیا تھا پروفیسر بخشی کو۔

"یہ خبر حنیدر کی ماں تک بھی پہونچ گئی تھی
"رسا کا بیاہ ہو گیا بیٹا"
"معلوم ہے ماں"
"رسا اچھی لڑکی تھی"
"ہاں"
"میں تو اسے تمہاری بہو بنانا چاہتی تھی"
"ماں کبھی کبھی تو تم بنا سوچے سمجھے بس بات کر ڈالتی ہو" حنیدر نے غصے سے کہا۔
"لیکن اس میں بری بات کیا تھی بیٹا؟"
"اب جب رسا کا بیاہ ہو چکا ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہئے"
"میں تو تمہیں سے بات کر رہی ہوں بیٹا، کسی غیر سے تو نہیں"
"اس معاملے میں میں بھی غیر ہی ہوں"
ماں خاموش ہو گئی۔ سمجھ گئی حنیدر کو اس بات سے چوٹ پہنچی تھی۔
حنیدر سے زیادہ صدمہ اس کی ماں کو ہوا۔ وہ تو کئی مہینوں سے سوچ رہی تھی کہ رسا کی ماں سے بات کرے لیکن کوئی ایسا موقعہ ہی نہ ملا تھا اور اب تو وقت نکل گیا تھا۔ لیکن یہ چوٹ گہری تھی۔ ماں تو پی گئی لیکن تحمل سے برداشت نہ کر سکی حنیدر تو جیسے اندر سے ایک دم ٹوٹ گیا تھا۔ جیسے اس کی شخصیت کا تار و پود ہی بکھر گیا تھا۔ سب کچھ ایک مرکز پر اکٹھا کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔

بی، ایڈ کا رزلٹ نکلا۔ رسا بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تھی

اور ان اسکول والوں نے ـــــ جہاں حتیدر نے رسنا کی ملازمت کی بات کی تھی حتیدر نے رسنا کو بلانے کے لئے کہا تھا اور انہوں نے جواب دیا تھا کہ وہ ایک اسکالر شپ لے کر ہندوستان سے باہر چلی گئی ہے۔ کسی ایڈوانس ٹریننگ کے لئے۔

اور پھر نیا داخلہ ہوا نئے اسٹوڈنٹس آئے نیا ماحول بنے لگا لیکن حتیدر کے لئے تو جیسے اب کچھ رہا ہی نہیں۔ وہ تو اب بس جی رہا تھا بغیر کسی احساس کے اور بنا کسی ولولے کے۔ دہلی سے آئی پی کالج کی گریجویٹ ایک لڑکی نے بی ایڈ میں داخلہ لیا تھا اس کی شکل ایک دم رسنا سے ملتی تھی لیکن اس کے بال ترشے ہوئے تھے جو سدا اس کے کندھوں پر جھولتے رہتے تھے ایک آدھ بار حتیدر نے سوچا اگر وہ لڑکی مصنوعی بال لگا لے اور سیدھی مانگ نکالے تو بالکل رسنا نظر آنے لگے لیکن پھر وہ سوچتا کوئی بھی لڑکی رسنا نظر نہیں آسکتی تھی، رسنا نہیں بن سکتی تھی۔ رسنا ایک ہی تھی اور وہ اسے چھوڑ گئی تھی اور اب دوبارہ واپس نہیں آسکتی تھی اس کے اور رسنا کے درمیان ایک دنیا کا فاصلہ تھا جو کسی بھی طرح کم نہیں ہو سکتا تھا جس مرحلے کے لئے اس نے اتنا فاصلہ طے کیا تھا وہ مرحلہ اسے چھوڑ گئی تھی اس لئے اس نے بے دردی سے جو تھوڑی سی قربت کا احساس کیا تھا۔ وہ بھی ختم ہو گیا۔

حتیدر اب ایک ہی مقام پر کھڑا تھا۔
اکیلا اور بے یار!
کئی ماہ گذر گئے
اسے لگا جیسے صدیاں گذر گئیں۔

کالج کے ڈسکشن جو سلسلہ ابھی اس کی سرپرستی میں کامیاب ہوتے آئے تھے، بالکل پھیکے پڑ گئے۔ وہ دن رات ڈراموں کی ریہرسل اور مباحثوں کی تیاری کراتا رہتا تھا، سب ختم ہو گئے۔ پرنسپل نے دو ایک بار اس سلسلے میں اس سے کہا بھی لیکن اس نے اپنی معذوری ظاہر کی۔

اور ایک شام جیتندر کی ماں نے اسے بتایا کہ رسنا کے دو جڑواں بچے ہوئے تھے جو چار ہی دن بعد مر گئے تھے۔ یہ خبر اسے رسنا کی ممانی سے ملی تھی۔ جیتندر نے یوں تو یہ خبر بڑی بے نیازی سے سُنی لیکن اس رات وہ بے حد رویا۔ کاش اس گھڑی وہ رسنا کے قریب ہوتا! رسنا دوسری ہی ٹائپ کی لڑکی تھی۔ کس نے اس کا خیال کیا ہو گا؟ اسے محسوس ہوا جیسے رسنا زیادہ دن نہیں جئے گی اور ایک دن ایسا آئے گا جب اسے بدقسمتی سے رسنا کی موت کی خبر ملے گی اور وہ اس دن اپنے کمرے میں موم کی بتیاں جلا کر اور لوبان سلگا کر رسنا کی رُوح کے لیے دعائیں مانگتا رہے گا اور گرجا گھر میں جا کر کرائسٹ کی صلیب کو چُومے گا اور سر جھکا کر کہے گا۔

'خداوندا! رسنا جیسی معصوم رُوحوں کو اپنی عظمت میں پناہ دے تاکہ وہ موت کے بعد شانتی حاصل کر سکیں!'

اُس رات جیتندر اپنے کمرے میں ہلکی ہلکی سسکیاں سُنتا رہا اور اس کے کندھے آنسوؤں سے بھیگتے رہے۔ اور کوئی اس کے دُکھے

لیے بالوں کو کھینچ کھینچ کر اسے ترتیب کرتا رہا۔

کالج والوں سے جیتندر کے اختلافات بڑھتے گئے۔ آخر اس نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا ———— اسٹاف کے سبھی ساتھیوں نے اسے سمجھایا لیکن وہ نہیں مانا اور جس روز وہ کالج کی ملازمت چھوڑ کر گھر پہونچا اور ماں کو یہ خبر دی تو وہ اسے برداشت نہ کر سکی۔ اسے دل کا دورہ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے موت کے بے رحم ہاتھ اسے ہمیشہ کے لیے جیتندر سے چھین لے گئے۔ وہ محل جو گرتے گرتے آخر دو اینٹوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، اب مکمل طور پر مسمار ہو گیا تھا ———— اب صرف ایک ہی ٹوٹی پھوٹی اینٹ رہ گئی تھی۔ جسے کہیں بھی پھینکا جا سکتا تھا۔ قافلے کے صرف دو ہی مسافر رہ گئے تھے اور اب ان میں سے بھی ایک بچھڑ گیا تھا۔ اب منزل کی چاہ ہی کیسے تھی!

ماں کی چتا کو آگ دے کر وہ شمشان میں ایک طرف کھڑا تھا۔ سر جھکائے، خاموش اور غمگین۔ اسے ماں کے ساتھ کی ہوئی ناانصافیاں اور زیادتیاں یاد آ رہی تھیں۔ ماں کی صرف ایک ہی حسرت تھی کہ جیتندر شادی کر لے اور وہ اتنا بدقسمت تھا کہ ماں کی یہ چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہ کر سکا تھا۔

مرنے سے ایک دن پہلے اس نے کہا تھا۔

"میں نے ایک لڑکی دیکھی ہے بیٹا"

"اس میں نئی بات کون سی ہے، لڑکیاں تو دیکھنے کے لیے ہی ہوتی ہیں"

"وہ بہت اچھی ہے"

"لڑکیاں اچھی ہی ہوتی ہیں جب تک اُن کی شادیاں نہیں ہو جاتیں"

"اب تم شادی کر لو"

"لیکن کروں کس سے؟"

"ایم اے میں پڑھ رہی ہے۔ بڑی سُندر ہے"

"تمھیں کیا تکلیف ہے؟ نوکر ہے جو گھر کا سارا کام کر دیتا ہے"

"بہو آئے گی تو میری دیکھ بھال کرے گی"

"اگر دیکھ بھال کروانی ہے تو ایک ٹھیٹھ دیہاتی، اَن پڑھ جاہل لڑکی لے آؤ"

"تم اپنی بوڑھی ماں کی بات نہیں مانو گے؟" ماں نے منّت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"تمھاری سبھی باتیں تو مانتا ہوں ——— ایک نہ بھی مانوں تو کیا ہوا؟"

"تم صرف یہ بات مان لو، باقی کچھ نہ مانو۔ ہر بات سے انکار

کر دو بے شک ۔"

" لیکن میری شادی تو ہو چکی ہے ماں ۔"

" سچ ــــــ کیا کہہ رہے ہو تم ــــــ !" ماں زور سے چیخی ۔

" سچ ہی تو کہہ رہا ہوں ۔"

" کون ہے وہ ؟"

" میری تقدیر ! ــــــ ماں تم بغیر بہو کے نہیں ہو۔ اس سے اولاد بھی ہو گی ۔ جتنی چاہو اتنی ۔"

یہ کہہ کر جیتندر بڑی کرخت ہنسی ہنسا تھا اور ماں نے سسکنا شروع کر دیا تھا ــــــ اسے کیا خبر تھی کہ اس کی ماں کی وہ آخری سسکیاں تھیں جو وہ اُس گھڑی سُن رہا تھا ۔ اس کے بعد اس کی ماں کبھی نہیں روئے گی ۔ رونا اب اسے ہو گا ۔ اپنے لیے ۔ اپنی اولاد کے لیے جو اس کی تقدیر کی کوکھ سے جنم لے گی اور اس کی شکستوں کی گود میں پل کر جوان ہو گی اور پھر ایک ایک کر کے وہ بھی اسے چھوڑ جائے گی اور پھر کوئی بھی اس کا اپنا نہ رہے گا اس کی اپنی بدنصیبی بھی نہیں ــــــ اور وہ زندگی کے لق و دق صحرا میں ایک ٹھنٹھ کی طرح کھڑا لوؤں کے تھپیڑے اور طوفاں کے زوردار ہتھوڑے سہتا رہے گا ۔

یہ سب باتیں یاد کر کے ، شکستاں کے ایک طرف کھڑا وہ

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ——— اور شمشان میں آئے اس
کے دوست اور واقف اسے خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔
کچھ ہی دنوں بعد حیندر نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا۔

اب کوئی بندھن نہیں تھا جو اسے قائم رکھنا تھا ——— کوئی
تعلق نہیں تھا جس کے لیے اسے کسی خاص مقام پر رہنے کی ضرورت
تھی۔ اب وہ بندھن مُکت تھا ——— کہیں بھی جا سکتا تھا۔
اب اس کی ماں کا بڑھاپا نہیں تھا۔ رینا کا پیار نہیں تھا۔ ایسا
کیرئیر نہیں تھا ——— اب تو کھلا نیلا آسمان تھا اور آزاد
دھرتی تھی۔ اور اس کے قدم تھے جو وہ کسی سمت بھی اٹھا سکتا
تھا ——— اس نے جی بھر کر آوارگی کی۔ جو رقم اس کی ماں نے
اس کی آمدنی سے بچا رکھی تھی، سب خرچ کر ڈالی۔ ماں کے تمام زیور
بیچ ڈالے۔ صرف ایک چوڑی اپنے پاس رکھی وہ بھی اس لیے کہ ماں
وہ چوڑی پہنا کرتی تھی اور اس کی کمزور کلائی میں جب اس کی
چوڑی کا رنگ چمکتا تھا تو جانے کیوں حیندر کو بڑی شانتی ملتی
تھی۔ اسے لگتا تھا کہ چوڑی کی وہ چمک انسان کے اُجلے مستقبل
کی امانت دار تھی۔ اس مستقبل کی جس کے لیے انسان صدیوں سے
جدوجہد کرتا چلا آ رہا تھا۔
وہ امرناتھ کی گپھا سے لے کر کنیا کماری تک ہو آیا۔ بمبئی کے

میرٹھ ڈرائیو سے لے کر برما کے گھنے جنگلوں تک گھوم لیا لیکن تسکین اسے کہیں بھی نہ ملی۔ اس نے مندروں میں گھنٹیاں بجائیں، مسجدوں میں سجدے کیے۔ گرجا گھروں میں انجیل کو پڑھا۔ گوتم بدھ اور جینیہ مہاپرشوں کے پیروکاروں کے اپدیش سنے۔ گورو نانک کی بانی پڑھی لیکن اسے یہی لگا کہ راحت کہیں بھی نہیں۔ سچائی کی روشنی کہیں بھی جگہ دکھائی نہیں دیتی۔ یوں ہی اندھیرے میں بھٹکتے بھٹکتے ان کی آخری ہڈی کی چک کا سہارا لیے وہ پھر ایک شہر میں پہنچ گیا۔ کچھ دیر اپنے تھکے ہوئے ذہن اور بے جان انگوں کو سہلاتا رہا اور اُسے محسوس ہوا کہ زندگی سے کٹ کے رہنا اور اس کے تقاضوں کو توڑ کر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب تک وہ زندہ ہے اُسے کچھ کرنا ہوگا۔

اور ایک دن اُس نے پھر ایک ٹریننگ کالج میں پڑھانے کا کام شروع کر دیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ دراصل وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا اور کہاں جائے گا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ پروفیسر جتیندر کمار تھا اور ایک کالج میں ملازم تھا اور بس!

اس نے ایک بار اپنے ایک پروفیسر دوست سے کہا تھا

”میں کون ہوں، میں خود نہیں جانتا۔ میں کیا کرتا ہوں، مجھے خود نہیں معلوم۔ میں کیوں جی رہا ہوں، کچھ خبر نہیں۔ میں کیا کرنا چاہتا ہوں؟ شاید کوئی بھی نیک کام نہیں!“

یا تو وہ جنونی ہو گیا تھا یا ناستک۔ لیکن اسے اپنے آپ میں کبھی احساس نہ ہوتا تھا کہ وہ کیا تھا!

کالج سے آکر وہ گھر کی چار دیواری میں قید ہو جاتا اور پڑھتا رہتا۔ جو کچھ بھی مل جاتا اسے انہماک سے پڑھتا۔ بھگتی کی کتابوں سے لے کر ویدانت کے گرنتھوں تک!

اور پھر ایک دن پروفیسر بھگتی سے اس کی اچانک ملاقات ہو گئی۔ وہ اس کے کالج میں کسی امتحان کے سلسلے میں آئے تھے۔ پروفیسر بھگتی نے اسے دیکھا تو آنکھیں رُلائی آ گئی۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟"

"مزے میں ہوں" جیتندر نے جواب دیا تھا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ جس خول میں وہ دُبکا پڑا تھا اس میں داخل ہو کر کوئی اسے ڈسٹرب کرے۔ اسے کسی کے چھونے سے بھی تکلیف ہوتی تھی۔ وہ پروفیسر بھگتی سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن انھوں نے اُسے چھوڑا نہیں بلکہ اس کے ساتھ لگا رہا۔ اور پھر اس کے ساتھ اس کے گھر بھی آ گیا۔ گھر میں آکر اس نے دیکھا کہ جیتندر نے کیا حال بنا رکھا تھا۔ زندگی میں اتنی بے ترتیبی اور اتنا انتشار۔ گھر بھی اتنے ڈراؤنے ہو سکتے ہیں، اسے اس کی زندگی میں پہلی بار احساس ہوا اس نے محسوس کیا کہ جیتندر زندگی کے صحرا میں اتنی دور نکل آیا تھا کہ

اب وہ واپس نہ جا سکتا تھا۔ اب اسے اُن راستوں کا خیال ہی
رہا تھا جن پر چلتے ہوئے وہ یہاں تک آگیا تھا۔ زندگی کتنی ظالم ہوسکتی
ہے، کتنی بے درد ہوسکتی ہے اور کتنی بے رحم ہوسکتی ہے۔ یہی بات
اس کے ذہن میں گھومتی رہی۔ اور پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی
کوشش کی اور کہا۔

"کبھی آؤ نا اُدھر ہماری طرف بھی؟"

"کیا رکھا ہے اب وہاں میرے لیے۔ —— سب بندھن
توڑ کر آیا ہوں۔"

"مگر ایک رشتہ تو قائم ہے ابھی۔"

"کون سا رشتہ؟"

"رسنا کا۔ میں اُس کا ماموں ہوں۔ تم میرے کولیگ رہ
چکے ہو۔ اور . . ."

لیکن اس کے آگے پروفیسر کشتی کچھ نہیں بولے۔
رسنا کا نام اتنی مدت کے بعد سنتے ہی جیتندر کے چہرے
پر ایک عجیب ساجذبہ چھلک آیا —— اس کی آنکھوں میں ایک
چمک سی آگئی۔ اس کی آواز میں رس گھل گیا۔ ماضی کا کوئی لمحہ
دوبارہ جی اٹھا تھا۔

"کہاں ہیں رسنا آج کل؟"

"وہیں ٹیریوں میں سے چاری بہت ہی دکھی ہے۔ رسنا کے

نادر کو معلوم نہیں تھا کہ وہ آدمی پہلے سے شادی شدہ تھا۔ اور اس کے بچے بھی تھے۔ وہ لوگ دھوکے میں آگئے۔ یہ بات رسنا کو نیروبی جاکر معلوم ہوئی۔

"رسنا نے لکھا ہے یہ سب ؟"

"نہیں۔ اس نے تو ہندوستان سے جانے کے بعد نہ ہی کسی کو خط لکھا ہے نہ ہی یاد کیا ہے۔ یہ سب تو کیسی اور نے لکھا ہے۔ اور رسنا کے نادر نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی بلکہ یہ کہا ہے کہ یہ رسنا کا ہی معاملہ ہے۔ اسے ایڈجسٹ کرنا چاہیے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

"کروال پیپل (CRUEL PEOPLE) جیتندر نے بڑی حقارت سے کہا۔

"یس۔ رسنا تو وہاں سے آنا چاہتی ہے۔ سپریشن کے لیے تیار ہے۔ لیکن وہ لوگ اسے آنے بھی نہیں دیتے۔" پروفیسر بخشی نے کہا۔

"فیٹ (FATE) پروفیسر بخشی فیٹ (FATE) میں قائل ہو گیا ہوں۔"

"ہتھیار ڈال دیے آخر ؟"

"یس کمپلیٹ سرنڈر۔ (COMPLETE SURRENDER)

جیتندر کی بات سُن کر پروفیسر بخشی کو بڑا دُکھ ہوا۔ جیتندر

کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ زندگی انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ رسا کے بارے میں اور کوئی بات نہیں ہوئی۔
اس سے اگلے دن پروفیسر رخصتی چلے گئے۔

حیندر کے سینے میں جلے ہوئے داغ کچھ روز اور جلتے رہے۔ کچھ روز اور ہر شام اس کے دکھے لیے بال بکھرتے رہے۔ وہ بکھرے ہی رہتے جب تک رسا انہیں چوم نہ لیتی۔ تصور کبھی کبھی کتنا ستم ڈھاتا ہے۔

اور پھر ایک طویل مدت گزر گئی ـــــــ
وہ اس شہر کو بھی چھوڑ گیا۔ یہ شہر بھی اسے راس نہ آیا۔
اب وہ ایک نئے شہر میں تھا اور رسا کو بھولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس کی یادوں کو، اس کے پیار کو، اس کی تکلیفوں کو، اس کی بدنصیبی اور مجبوری کو ـــــــ وہ ہر اس چیز کو بھلا دینا چاہتا تھا جس کا تعلق رسا سے ہو۔ خود اپنے ماضی کو بھی۔ کیونکہ اس کے ماضی کی اہمیت تو صرف رسا سے تھی۔ ورنہ اس کے ماضی میں کیا رکھا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ بغیر رسا کے اس کا ماضی ایک بے چراغ گاؤں تھا جس میں کچھ ٹوٹی پھوٹی دیواریں، کچھ دیمک کے کھائے کواڑ، کچھ مٹی کے ڈھیر۔ اور اِدھر اُدھر بکھرے کچھ برتنوں

کے ٹکڑے تھے اور خاموشی تھی اور اندھیرا تھا اور زندگی کا بھرپور
تسلسل یوں تھا۔

اور آج اُسے ایک نیرنگ لفافہ ملا تھا۔
سپاٹ کورے صفحے ——— ہیئرپن سے ایچ کیے
ہوئے حسن کا ہلکا گلابی رنگ بڑا پیارا تھا۔ لفافے پر آر، ایم، ایس
کی مہر تھی۔ اسٹیشن کے پہلے حروف صاف نہیں تھے اس لیے یہ
معلوم نہیں ہوسکتا تھا کہ لفافہ کہاں سے ڈالا گیا تھا۔ پھر بھی
اس نے پہچان لیا تھا کہ یہ لفافہ رسالہ ہی کا تھا۔ سات برس پہلے
والے سولہ صفحے، لیکن ایک دم خالی ——— نہ خط لکھا تھا نہ
کوئی پوسٹ سکرپٹ ——— اس کی زندگی جیسے ایک کورے
کاغذ کی سطح تھی جس پر کوئی تحریر نہیں تھی۔ اگر کبھی کوئی تھی وہ لمحات
کی مسلسل لوچھاڑ سے دھل گئی تھی۔ اور اب ایک بے داغ سفید
پھیلاؤ تھا جو کبھی سمٹ کر ایک نقطہ بن جاتا اور کبھی پھیل کر اُفق کی
حدوں کو چھونے لگتا تھا۔
اُسے لگا جیسے رسالہ اب ایک عورت نہیں رہی تھی بلکہ ایک ڈیڈ لیٹر

بن گئی تھی جس کی کوئی منزل نہیں تھی ——— جسے کہیں نہیں پہنچنا تھا جو آپ ہی اپنی منزل تھی اور سینکڑوں، ہزاروں اور لاکھوں میلوں کا فاصلہ طے کر کے وہیں پہنچ گئی تھی جس مقام سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔

خالی کورے صفحے حیدر کی آنکھوں سے بہے ہوئے آنسوؤں سے بھیگتے رہے تھے اور اب اس کے ذہن کے چٹیل میدان میں دھوپ بکھر آئی تھی اور ایک نادیدہ ببول کے ایک سرکچے کانٹے کی طرح اس کی پتلیوں میں چبھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خون کی ایک بوند ٹپکی اور سارے خالی صفحوں پر پھیل گئی ——— اس نے سوچا اب وہ ان خالی صفحوں پر رسنا کی کہانی لکھنا شروع کرے گا اس سے آگے جہاں پر رسنا نے سات برس پہلے ٹرین کے برتھ پر تمام رات جاگ کر نامکمل چھوڑ دی تھی۔ وہ نئے ہی سرے سے خون سے کہانی شروع کرے گا تاکہ وہ مکمل ہو سکے اور اس کی داستان کو کوئی عنوان مل سکے ——— وہ تمام دن اپنے پرانے فائلوں اور کاغذوں میں سات برس پہلے کی وہ کھوئی ہوئی کہانی تلاش کرتا رہا۔ اور اس رات اس نے سگریٹ پھونک پھونک کر اور نیند بھری آنکھوں میں دھوئیں کے مرغولے لہرا لہرا کر رسنا کی پرانی ادھوری کہانی

مکمل کر ڈالی

اس رات اُس نے اپنی زندگی کا جھروکا کھُلا رکھا - اور ٹھنڈے نرم جھونکے آکر اُسے تھپکتے رہے - اور چاندکی کرنیں رسنا کی کہانی کو سنوارتی رہیں اور وہ رات کے پچھلے پہر کہانی کا عنوان تلاش کرنے کے لیے بھٹکتا رہا - بھٹکتا رہا کہ بھٹکنا ہی اس کا مقصد تھا -

ٹھیک سات دن کے بعد -
اتوار کی ایک السائی ہوئی دوپہر -
ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی ——— آکاش میں گھٹائیں چھائی تھیں اور حینندر پلنگ پر اوندھے منہ پڑا Beloved Infidel پڑھ رہا تھا اور اُس کی نگاہوں میں کچھ بھولی بسری تصویریں اُبھر رہی تھیں - ایسی تصویریں جو واضح ہوتے پر بھی واضح ہو جاتی ہیں، جن کی کوئی رُوپ ریکھا نہیں ہوتی لیکن پھر بھی پہچانی جاتی ہیں ——— نوکر کو اُس نے سینما جانے کی چھٹی دے دی تھی تاکہ اسے تنہائی کا مکمل احساس رہے اور اس

کی خاموشی میں اُس کی کمی زندگی کی ضرورتیں بھی مخل نہ ہوں۔

باہر رکتا کی مسلسل گھنٹی تھی۔ پہلے تو جیتندر نے دھیان نہ دیا لیکن جب گھنٹی دوبارہ تھی اور لگاتار بجتی گئی تو وہ پلنگ سے اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں آگیا۔

بارش پہلے سے تیز ہوگئی تھی ——— گھٹائیں اور نیچے جھک آئی تھیں اور روشنی اور تاریکی کا ایک عجیب سا امتزاج فضا میں گھل گیا تھا ——— اُس نے لپک کر گیٹ کھولا۔ اور اسے لگا جیسے اُس کے دل کی دھڑکنیں ایک دم رُک گئی تھیں ——— رکتا سے رسنا اُتر رہی تھی۔ وہ گیٹ کھول کر ایک طرف کھڑا ہوگیا اور بارش میں بھیگتا رہا۔ اور رسنا اُس انداز سے گھر کے اندر داخل ہوئی جیسے یہ اس کا اپنا گھر تھا ——— اور وہ صرف ایک آدھ دور کے لیے کہیں باہر گئی تھی ——— رکشا والا ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس برآمدے میں رکھ کر چلا گیا۔ رسنا نے کرایہ شاید اسے پہلے ہی دے دیا تھا۔ جیتندر کچھ لمحے گیٹ کے ساتھ کھڑا بارش میں بھیگتا رہا۔ پھر اس نے گیٹ بند کیا اور برآمدے میں لوٹ آیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو رسنا اپنے گیلے کپڑے جھاڑ

رہی تھی اور اُس کے لیے گیلے بال اُس کے سارے وجود کو ڈھانپ لینے کی کوشش میں مصروف تھے ——— وہ اُسے بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل سات برس پہلے والی رسا تھی۔ رتی بھر فرق نہیں آیا تھا۔

" میرے اس طرح آنے پر حیرت ہوئی کیا؟ "
" نہیں "
" ایسا ہی موسم تھا نا ——— جب میں تمھیں چھوڑ کر گئی تھی "
اُس نے اپنے دائیں ہاتھ سے حیندر کے بال ایک دم لگاڑ ڈالے۔

" ہاں۔ ایسا ہی موسم تھا " اور حیندر کے ہونٹوں سے ایک لمبی آہ نکل گئی۔
" آئی ہیو کم بیک لائک اے ڈیڈلیٹر " رسنا نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔
" ٹو یور ڈیسٹی نیشن " ———
اور یہ کہتے ہوئے اُس نے آگے بڑھ کر رسنا کو اپنی بانہوں میں لے لیا

اور اس کا چہرہ رسنا کے گھنے گیلے گیسوؤں کی،
گھٹاؤں میں ڈوب گیا اور اس کے دماغ میں بے شمار
معطر اور بوجھل جھونکے لہرا گئے —— جن کی استمرا
ہی اس کا جیون ہے۔

ایک تھرڈ کلاس آدمی

شیکھر دو منٹ بھی دیر سے پہنچتا تو ٹرین چھوٹ گئی ہوتی۔
بدحواسی کے عالم میں وہ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ یہ قلی لوگ مسافروں کا میل
ملیس قائم رکھنے میں کتنا اہم رول ادا کرتے ہیں۔ قلی نے کمپارٹمنٹ میں سامان
سنبھال کر رکھا اور دس کے بدلے دو روپے کا نوٹ اسے تھما دیا۔ قلی سلام کرکے
کمپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا۔

کمپارٹمنٹ میں بیچ کی ایک برتھ پر ایک ہی عمر کے دو بچے بیٹھے تھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی شکل
بالکل ایک جیسی معلوم ہوتا تھا دونوں جڑواں بچے ہیں۔ ان کی عمر تیرہ
چودہ برس کے لگ بھگ تھی دیکھنے میں بہت پیارے تھے۔ دوسری
برتھ پر ایک خاتون بیٹھی تھی جو غالباً ان دونوں بچوں کی ماں تھی۔ اگر
لڑکی کی عمر میں بچیس برس اور ملا دیئے جائیں تو اس کی ماں کا تصور ذہن میں
آسکتا تھا اور اگر ماں کی عمر میں سے اتنے ہی سال کم کر دیئے جائیں

خاتون تو خاموش رہی، جواب اس کے پیارے سے خوبصورت لڑکے نے دیا۔

"آئی ایم سوری۔"

شیکھر نے سگریٹ سونگھ کے ساتھ لگی ایش ٹرے میں ڈال کر مسل دیا
خاتون اب بھی خاموش رہی۔

شیکھر کی بے چینی پھر لوٹ آئی۔ اس کے بعد اس نے سگریٹ نہیں سلگایا
اپنے ساتھ لائے بہت سارے میگزینوں کو الٹتا پلٹتا رہا اور واسا کے
بارے میں سوچتا رہا۔ واسا بھی اس کے ساتھ ہی جا رہی تھی۔ سامنے
والی سیٹ پر بیٹھی اس وقت وہ خاموش لیکن بہت ہی پیاری سی خاتون
بیٹھی تھی، وہ سیٹ واسا نے اپنے لئے ریزرو کرائی تھی لیکن اس کے ڈیڈی
یکایک بیمار ہو گئے اور اس نے کل ہی ریزرویشن کینسل کرائی تھی۔ شیکھر اصرار کرتا
تو واسا ساتھ چل بھی پڑتی لیکن اب سیٹ بھی نہ مل سکتی تھی شیکھر نے اسے
ساتھ چلنے کے لئے اصرار بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے ڈیڈی بیمار تھے اور اسے اپنے
ڈیڈی کے پاس رہنا چاہئے تھا۔ خیالات میں ڈوبے ہوئے شیکھر نے پھر
سگریٹ سلگایا تو ایک ہی کش لے کر اسے ایش ٹرے میں مسل دیا

"آپ سگریٹ پیجئے، کیوں کی بات بہ جائیے۔"

ایک گھنٹہ میں خاتون کے منہ سے پہلا جملہ نکلا تھا۔ شیکھر نے حد
ممنون نظروں سے اسے دیکھا اور پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

"تھینکس میڈیم اور چلڈرن آر ریئلی چارمنگ!"

"آئی ڈونٹ وانٹ ٹو سی مائی کوسیلی پیٹس۔"

لڑکے نے جواب دیا۔

"نی بو، چھوٹو!" خاتون نے اسے ڈانٹتے ہو کہا۔

شیکھر کو ایک دم وسدا کا خیال آگیا، جس نے کہا تھا کہ بیٹل بلیس کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہے تو ہم بالکل بات نہیں کریں گے تبھی تو ممی ہمارا الٹا بھی اچھا نہیں لگا

اس بار لڑکی نے جواب دیا تھا۔

اور پھر چھوٹو ور اس کی ممی اوپر والی برتھ پر چڑھ گئے اور سامنے لیٹ گئے اس سے پہلے ایک اور بھی عجب بات ہوئی تھی۔

گاڑی اسٹارٹ ہونے کے بعد جب ٹکٹ چیکر ان کے کمپارٹمنٹ میں آیا تھا تو اس نے سمجھا تھا یہ چاروں ساتھ ایک ہی ساتھ ہیں۔ اس لئے اس نے شیکھر ہی سے ٹکٹ مانگے تھے۔ شیکھر نے صرف اپنا ہی ٹکٹ دکھایا تو ٹکٹ چیکر نے پوچھا۔

"باقی ٹکٹ؟"

"یہ تو تمہارا ہوں:"

اس نے اپنے پرس میں سے تین ٹکٹ نکال کر شیکھر کے حوالے کر دیئے۔ چھوٹو کیا اور شاید اس کی ممی کو بھی یہ بات بری لگی تھی کہ ٹکٹ چیکر نے ان کے ٹکٹ بھی شیکھر سے کیوں مانگے تھے۔

چھوٹو ور اس کی ممی کے اوپر کی برتھ پر چلے جانے کے بعد شیکھر اور وہ خاتون ایک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ ٹکٹ چیکر کے ٹکٹ چیک کرتے وقت ہی اسے ان تینوں کے نام معلوم ہو گئے تھے۔

شمع سہل۔
چھوٹو۔

رانی۔

لڑیں جب متھرا پوری کی تو شیم پہل نے چھوٹو اور رانی سے کھانا کھا لینے کو کہا۔ دونوں نے انکار کر دیا۔ چھوٹو نے ایک مارا اپنی لڑیا سے نیچے اتر کے ایک ایک کمبل اور تکیہ ہولڈال سے نکالا اور پھر اوپر والی برتھ پر چلا گیا۔ اس نے ایک کمبل اور ایک تکیہ رانی کی برتھ پر پھینک دیا

"تو تم لوگ واقعی کچھ نہ کھاؤ گے!"

شیم پہل نے برتھ پر بیٹھے بیٹھے ہی گردن اوپر کر کے ایک بار پھر دونوں بچوں سے پوچھا۔

"ہم مزدوروں کے بچے ہیں۔ مزدور بات ایک کہتا ہے دوسرے کو کھونا پیا ہوتا ہے۔ ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔" رانی نے جواب دیا۔

"تو بھوکے مر جاؤ گے!"

"مرنے کے لئے بھرا ہوا پیٹ ہونا ضروری نہیں۔" چھوٹو کا جواب تھا

اس کی ممی نے بھی کچھ نہ کھایا اور وہ کمبل اپنی برتھ پر بچھا کر اور تکیہ لگا کر لیٹ گئی اور اپنے پیروں پر کمبل اوڑھ لیا۔ شیکھر ایک اجنبی کی طرح یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور اس کے دماغ پر ایک عجیب سے رد عمل کا تاثر تھا۔

پھر شیکھر تھوڑی دیر کے لئے کاری ڈار میں نکل گیا۔ کمپارٹمنٹ کے دروازے بند تھے۔ اسے خیال آیا کہ باہر آتے وقت اپنے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا چھوڑ آیا تھا۔ بند کرنے کے لئے واپس پلٹا تو دیکھا دروازہ بند تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ کمپارٹمنٹ میں واپس آیا تو شیم پہل نے کمپارٹمنٹ کی روشنی کم کر دی تھی اور اپنے سرہانے والی

روشنی کو جلا کر کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ شیکھر اسی طرح پر خاموشی سے بیٹھ گیا پھر کچھ دیر کے بعد اس نے اپنا مختصر سا بستر برتھ پر لگا لیا اور اپنے سرہانے کی روشنی جلا لی۔

"دروازہ اندر سے بند کر دیجئے" شبنم سہل نے ایک پل کے لئے کتاب اپنی نظروں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

شیکھر نے جواب دیئے بغیر کمپارٹمنٹ کا دروازہ اندر سے بند کر دیا پھر وہ لیٹ گیا اور السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" جو واسو اسے دے گئی تھی پڑھنے لگا، اسے دل ہی دل میں اس بات کا افسوس تھا کہ اس کی وجہ سے وہ دونوں خوبصورت جڑواں بچے بھوکے سو گئے اور ان کی ماں نے بھی کچھ نہ کھایا تھا۔ اب پریشان ہو گئی تھی۔ کھایا تو اس نے بھی کچھ نہ تھا۔ ناشتہ کھانے کا جو پیکٹ اسے دے گئی تھی وہ بھی ایک طرف پڑا تھا۔

وہ شبنم سہل کے سوال پر اچانک چونکا۔

"آپ کی وائف آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟"

"وہ میری وائف نہیں تھی۔"

"جو لیڈی آپ کو کمپارٹمنٹ میں چھوڑنے آئی تھی وہ کون تھی؟"۔

"میری دوست، میری اسٹوڈنٹ۔"

"اور آپ کی ——؟"

"جی —— میں ان میریڈ ہوں۔"

"کیا آپ کی اسٹوڈنٹ آپ کو اس طرح سگریٹوں کے پیکٹ لا کر دیتی ہے؟"

"پہلے نہیں تھی۔ اب سے میری دوست سی ہے۔ جس سے ایسا کرتی

سے ہے۔"

"لیکن آپ کا خیال تو بہت رکھتی ہے وہ لڑکی!"

"اس کی مہربانی ہے۔"

"آپ کہاں پڑھاتے ہیں؟"

"دہلی یونیورسٹی میں۔"

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"سکاٹ لینڈ۔"

"کیوں؟"

"ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے۔"

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"ہم سنگاپور جا رہے ہیں۔"

"وہیں رہتی ہیں آپ؟"

"نہیں میرے شوہر ہیں وہاں۔ ایک فیکٹری لگانے کے لئے بلایا گیا ہے انہیں۔"

"انجینئر ہیں؟"

"جی۔ بچوں کی چھٹیاں تھیں۔ انہیں گھمانے لے جا رہی ہوں۔"

"آپ کے بچے بہت پیارے ہیں۔"

"پبلک اسکول میں پڑھتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ میچیور ہیں۔"

"جس ایج سے ہم گزر رہے ہیں۔ اس کی یہی ویلیوز ہیں۔"

شمیل شاید شیکھر کے اس نظریئے سے متفق نہیں تھی۔ اس لئے اس نے کوئی جواب نہیں دیا پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ پانی پینے کے لئے اٹھی تو شیکھر نے بوتل سے گلاس میں پانی انڈیل کر اسے دیا اس نے پانی پی لی، جگ کے اندر خالی گلاس دھو کر رکھا گیا تو شیکھر بولا۔

"اپنے دیکھئے۔ یہ میں رکھ دوں گا۔"

"آپ کی دوست کا کیا نام ہے؟"

"واسا"

"بہت خطرناک نام ہے۔"

"لیکن وہ لڑکی بالکل خطرناک نہیں بہت معصوم ہے۔"

"ورنہ آپ کی دوست کیوں ہوتی؟"

شمیل پہلی بار ہنسی تھی پچھلے تین گھنٹوں سے جو ایک عجیب سا بوجھ چھا رہا تھا شاید یہی اس کی اس کیفیت کی غمازی تھی۔ اس میں پہلی بار ہنسی کی اس پھوار سے بارش آگئی تھی۔ شیکھر کو بہت اچھا معلوم ہوا۔ آمنے سامنے کی برتھوں پر اپنے اپنے بستر وں میں لیٹے ہوئے اپنے سرہانے کی روشنیاں جلا کر کتاب پڑھتے ہوئے، دو اجنبی مسافروں میں اسی طرح کی بے مقصد گفتگو کی بھی کتنی بڑی اہمیت تھی الفاظ کی تو کوئی اہمیت نہیں ہوتی ان کی اہمیت تو ان کے ساتھ جڑے خیالات اور جذبات سے بنتی ہے۔ الفاظ اور کا سرمایہ تو محض پتے ہیں۔ جب وہ کسی کاریگر کے ہاتھوں سے اسی طرح تراشے جاتے ہیں جیسے سنگ تراشوں کے ہاتھوں سے پتھر کی مورتیاں۔

پھر شیکھر کو محسوس ہوا شمیل سو گئی ہے۔ اوپر کی برتھ پر لیٹے

ہوئے اس کے جڑواں بچے بھی گہری نیند سو رہے تھے ایک طرف وہ جاگ
رہا تھا اور رہ رہ کر یہی سوچ رہا تھا کہ اگر واسا کے ڈیڈی اچانک بیمار
نہ ہو جاتے تو سامنے کی برتھ پر شمس ہل کی جگہ اس وقت واسا لیٹی ہوتی ہم
ہوتی اور وہ اتنی جلدی سو بھی نہ جاتی کیونکہ ایسے تو دیر تک جاگنا
اچھا لگتا تھا۔

اگلی صبح جب ٹرین اٹارسی اسٹیشن پر رکی تو کمپارٹمنٹ کا ماحول ایک
دم بدل چکا تھا اپنے خلاف حسن متحدہ محاذ کا ترود عمل میں اسے دم گھٹا ہو
تھا وہ بالکل ٹوٹ چکا تھا اب تو چھوٹو اور رانی بھی اس کے ساتھ کھل کر
باتیں کرنے لگے تھے۔ ٹرین کا اسٹاپیج یہاں زیادہ تھا چھوٹو نے شیکھر سے
کہا۔

"انکل کچھ کھلاؤ گے نہیں ہمیں؟"

"ضرور کھلائیں گے، بولو کیا کھاؤ گے تم؟"

وہ چھوٹو اور رانی کو لے کر پلیٹ فارم پر اتر آیا اور ایک سرے سے لے
کر دوسرے سرے تک انہیں گھماتا رہا اور جو کچھ وہ کہتے رہے لیتا رہا۔ اور
جب کمپارٹمنٹ میں لوٹا تو دونوں کے کھانے پینے کی چیزوں سے لدے
تھے۔

"ارے کیا تم تو سارا اسٹیشن ہی اٹھا لائے ہو!"

"اسٹیشن کو چھوڑ دیا ہے، باقی سب کچھ اٹھا لائے ہیں!"

شیکھر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
پھر سب نے سارا کچھ ساتھ ہی بیٹھ کر کھایا اور گرم گرم چائے پی
کھانے کے دوران چھوٹو اور رانی نے بہت سی مزے دار باتیں کیں۔

"انکل آپ تو سگریٹ بہت پیتے ہیں"

"پیتا تو اور بھی بہت کچھ ہوں"

"اور کیا کیا؟"

"پانی!" یہ سن کر شمع ہنس پڑی۔

"اور؟" رانی نے پوچھا۔

"چائے"

"اور انکل؟" گڈو بولا۔

"وہسکی"

"آپ شراب بھی پیتے ہیں؟" یہ سوال رانی کا تھا۔

"شراب نہیں بیٹے، وہسکی"

"شراب اور وہسکی میں فرق ہوتا ہے کیا؟"

"ہاں ابھی تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں یہ فرق بتایا جائے۔

"ان کے ڈیڈی تو ان سب چیزوں کے خلاف ہیں"

شمع نے کہا۔

"کن چیزوں کے؟"

"چائے، سگریٹ، کافی، شراب؟

"کن چیزوں کے حق میں ہیں مسٹر سہل؟"

"بہت سادہ چیزوں کے"

"مثلاً؟"

"مونگ کی دال، ابلا ہوا پانی، ہری سبزیاں، صبح کی سیر"

بہت اچھی صحت ہو گی مسٹر سہل کی!"

یہیں پچھلے چار پانچ سالوں سے اکثر بیمار رہتے ہیں

میری صحت کیسی لگتی ہے تم کو؟" شنکر نے چھوٹو سے پوچھا۔

"بہت اچھی ہے انکل!"

"بنگلور جا کر ڈیڈی سے کہنا کہ وہ ان چیزوں کا استعمال کریں جن کے

وہ حلاف ہیں"

شنکر بولا۔

"وہ ہم سب کو گھر سے نکال دیں گے!"

شبنم بولی۔

"تو آپ میرے گھر آجانا!"

"کہاں رہتے ہیں آپ؟"

شنکر نے اپنے گھر کا ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر بھی بتا دیا اور کہا۔

"دہلی آئیں تو کبھی ٹیلی فون کیجیے"

اور اس کے بعد شنکر نے دو تین سگریٹ مارے اور دو ولر ریڈیٹ

وار انڈیا

پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

شبنم پہلا ہی لقمہ کھا کر سو گئی اور چھوٹو اور رانی کامکس پڑھنے میں لگ

گئے۔

رات کو جب ڈائننگ کار سے منگوایا ہوا کھانا آیا تو وہ کھل مل کر کھایا اور کھانے کا بل بھی شنکر ہی نے دے دیا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس حلیے میں کسی اعلیٰ فیملی کا ایک فرد بن کر جی ٹی ایکسپریس میں سفر کر رہا ہے۔

"ٹرین میں کتنی کلاسز ہوتی ہیں انکل؟"
راجی نے پوچھا۔
"فرسٹ اور سیکنڈ"
"تھرڈ نہیں ہوتی کیا؟"
"پہلے ہوتی تھی اب نہیں"
"کیوں؟"
"اب صرف تھرڈ کلاس آدمی رہ گئے ہیں جو فرسٹ کلاس میں ٹریول کرتے ہیں"
"کیسے آدمی ہوتے ہیں وہ؟"
"جیسا میں ہوں!"
سیکھر کی بات پر رشمی نے بے اختیار ہنس دی
"اور فرسٹ کلاس آدمی کیسے ہوتے ہیں؟"
چھوٹو نے سوال کیا۔
"جیسے تمہارے ڈیڈی!" اس کی ممی نے کہا۔
"جو مونگ کی دال کھاتے ہیں اور کیوں کو بکھر جانے سے روکتے ہیں۔"
راجی نے جواب دیا۔ اور پھر سب ہنس پڑے۔
اور پھر ایک تھرڈ کلاس آدمی فرسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں ایک
"فرسٹ کلاس آدمی کی فیملی کے ساتھ سفر کرتے اور ان سے ہنسی مذاق کرتے
کرتے سو گئے اپنی برتھ پر پڑا سو گیا اور سونے سے پہلے اسے واسنا کا
خیال آیا جو اس وقت اپنے بیمار ڈیڈی کے پاس بیٹھی ماں کی سلامتی
کی دعا کر رہی ہوگی۔

تیسرے دن صبح جب ٹرین مدراس سینٹرل پہنچی تو شیکھر تبسم سہیل اور اس کے دونوں جڑواں بچوں کو ساتھ لے کر انہیں مدراس شہر میں گھماتا رہا اور میرینا بیچ کی ریت میں ان کے ساتھ دوڑتا رہا اور کھیلتا گیا پھر ان سب کو بنگلور جانے والی گاڑی پکڑا دی اور اسے بھی اسی شام کالی کٹ جانا تھا۔ اگلی صبح وہیں کالی کٹ یونیورسٹی ہی میں تو اسے ایک سیمینار پریزیڈ کرنا تھا۔ کوئی دس بجے کے قریب جب وہ سب کو ایک ریسٹوران سے کھلا پلا کر باہر لایا تو اس نے پوچھا۔

"اب کیا ارادے ہیں؟"

"اسٹیشن ہی چلنا چاہیے۔ تین بجے کے قریب بنگلور جانے والی ٹرین ہے کوئی" تبسم بولی۔

"کسی دوسری ٹرین سے چلیں گے ممی؟"

چھوٹے نے تو ریلی کی

"ہماری ریزرویشن اسی ٹرین کی ہے۔ ہمارے ڈیڈی بنگلور اسٹیشن پر ریسیو کرنے کے لئے کھڑے ہوں گے" تبسم نے کہا۔

دونوں بچوں کے چہرے اتر گئے۔

"ہاں بیٹا یہی ٹرین ٹھیک ہے۔ تمہیں سی آف کر کے میں بھی کالی کٹ چلا جاؤں گا"

"تو آپ بنگلور نہیں چلو گے انکل؟" راہل نے پوچھا۔

"نہیں۔ دہلی تم سے ملیں گے"

اس کے بعد کوئی بات نہ ہوئی شیکھر ان سب کو لے کر اسٹیشن آ گیا۔ ان کا سامان بنگلور جانے والی ٹرین میں رکھوایا اور جب تک ٹرین روانہ

رہ ہوئی اہلیں کے سامنے رہا۔ ٹرین چلنے سے پہلے شم لال نے پوچھا۔

"آپ کے سگریٹ کب تک چلیں گے؟"

"ڈھیر دں پیکٹ ہیں واپسی تک ختم نہ ہوں گے۔"

"آپ کب تک واپس دہلی پہنچ جائیں گے؟"

"گیارھویں تاریخ تک۔"

"میں بارہ کی صبح آپ کو ٹیلی فون کروں گی۔"

"شکریہ!" شیکھر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اور پھر ٹرین چل دی۔ وہ پلیٹ فارم پر کھڑا کمپارٹمنٹ کی کھڑکی کا دیکھتے ہوئے ہاتھوں کے ریشمی لوٹس میں ہاتھ ہلاتا رہا۔

اور پھر وہ پریس روٹیشن آفس کی طرف بڑھ گیا جہاں اسے اپنی ریزرویشن کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔

~~~~~~~~ ~~~~~~~~
~~~~~~~~

میرا آنچل میلا ہے

تمہارے جانے کے بعد کوئی مہینہ بھر تمہارے والا مکان خالی رہا۔ کسی
نے کرایہ پر لے لیا۔ مالک مکان نے کرایہ اور بڑھا دیا تھا اور تول مول ہو رہا تھا۔
صحن چنبیلی کی کلیاں کو توڑ توڑ کر تم سرہانے رکھا کرتے تھے اور میرے بالوں میں سجایا
کرتے تھے۔ وہ ٹہنیوں پر ہی مرجھا رہی تھیں گئی۔ یاد خیال آتا کہ میں دیوار پھلانگ
کر اندر چلی جاؤں اور ڈھیر ساری کلیاں اور جھولی بھر پھول توڑ لاؤں۔ گیٹ میں
تالا تھا لیکن دیوار پھلانگنے میں تو کوئی اڑچن نہیں تھی۔ لیکن صرف سوچتی ہی
ہی رہی اور دیوار پار نہیں کر سکی۔ دیواریں پار کرنے کے لئے جس ہمت اور قوت کی
ضرورت ہے وہ شاید مجھ میں نہیں۔ اس پر تو تم مجھے طعنے بھی دے چکے ہو۔ تم نے
دیوار پار کر لی اور میں پیچھے کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ میں دیکھتی رہی کہ تم اوپر ہی اوپر
چڑھتے جا رہے تھے۔ کبھی چاند ستاروں کی طرف۔ میرے اور تمہارے درمیان فاصلہ
بڑھتا جا رہا تھا اور آخر تم میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ صرف فاصلہ ہی رہا

رہ گیا ایک طرف زمین کی پستی تھی اور دوسری طرف آسمان کی بلندی۔ اور اس
بے پناہ فاصلے میں ہمالیہ اونچا کیا معنی رکھتا تھا۔ اور دھیرے دھیرے یہ بات
مرا وجود، میری شخصیت فاصلے کی اس خلاء میں تحلیل ہو گئی اور میں باقی کی ایک لہر
ہوا کا ایک جھونکا، یاد کا ایک رنگ اور خواب کی ایک پرچھائیں بن گئی اور آج وہی
پرچھائیں تم سے مخاطب ہے۔ سارا سماں دو دیر سے کچھ کہنا چاہتا ہے سلسلہ اس
کی بات جیسے پھر تک تمہارے مکان میں کوئی کرایہ دار نہیں آیا۔ اور اس بیچ میں
متردد رہا! ابھی آئی اپنی تمام تر لطافتیں اور نرماہٹیں لیے۔ اور میں اپنے مکان
کی چھت کی منڈیر کے ساتھ لگی تمہارے لان کو حسرت بھری نگاہوں سے تکتی رہی
اس میں آلوچے کا وہ چھوٹا سا پیڑ چاندنی میں تمہارے ہاتھ کی طرح نظر آ رہا تھا
اور جیسے لگ رہا تھا جیسے تم مجھے بلا رہے ہو اور مجھے اپنے بازو کے حلقے
میں لے کر اپنے قریب کر رہے ہو اور میں تمہارے سینے سے لگی تمہارے دل کی
دھڑکنوں کا سنگیت سن رہی ہوں۔ میں نے اپنا ماتھا منڈیر کے ساتھ ٹیک دیا
اور چاندنی رات کا اجالا میرے آنسوؤں کے اندھیرے میں ڈوبنے لگا۔ پورنیما
کے چاند کو جیسے کسی گھٹا نے اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ تمہارے لان میں اندھیرا
پھیل گیا اور آلوچے کا وہ پیڑ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ میری طرف بڑھتا ہوا
تمہارا ملائم ہاتھ پیچھے ہٹ گیا۔

پورنیما کی اس رات کو میں اکیلی تھی۔ ماں سب بچوں کو لیکر کسی شادی میں
گئی تھیں۔ پتا جی دورہ سے واپس نہیں آئے تھے۔ عام طور پر وہ اپنی متوقع
واپسی کی تاریخ کو ضرور لوٹ آتے تھے لیکن اس روز جانے کہاں رک گئے تھے
بہت دیر میں بستر پر پڑی پڑی پڑھتی رہی لیکن جی نہیں لگا۔ پورا چاند میری
کھڑکیوں کی سلاخوں سے مجھے جھانک رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کھول دی اور میز

انگ انگ اس رچی ہوئی چاندنی کے دریا میں بہاتا رہا۔ میرے کھلے بالوں سے جیسے چاندنی رس رہی تھی۔ میرے سارے جسم میں چاندنی کی ٹھنڈک سما گئی تھی۔ جو دھیرے دھیرے میری آتماؤں میں رچنے لگی تھی۔ میرا بیاد وپٹہ سنبھال کر کمرے سے باہر نکلی اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گئی۔ تمہارے مکان کی سیڑھیاں ہیں اس لئے تم کبھی چھت پر نہیں چڑھے۔ تمہیں پتا نہیں ہو سکتا کہ پورنما کی رات کو کھلی چھت کا کیا عالم ہوتا ہے۔ تم تو اپنے لان میں بستر پر پڑے گھاس پر ننگے پاؤں ٹہلتے رہے یا آرام کرسی میں بیٹھ کر سگریٹ کے دھوئیں میں چاندنی کی سندرتا کو ماند کرتے رہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے چھت کی منڈیر پر کھڑی ہو کر اپنے لمبے سیاہ بالوں کو ایک دم لہرا دیا تو چاندنی کا بہتا ہوا دریا لمحہ بھر کے لئے منجمد ہو کر رہ گیا اور میرا بلکا سا قہقہہ گونج اٹھا۔ تم لان میں کھڑے سگریٹ سلگا رہے تھے۔ ایک دم چونک اٹھے۔ جلتی ہوئی دیا سلائی نیچے گھاس پر گر گئی۔ روشنی کا ایک ہلکا سا شعلہ اٹھا لیکن اتنی بڑی وسعت میں گم ہو گیا۔ میرا قہقہہ ایک بار پھر گونجا۔

"میں جلاؤں سگریٹ"، میں نے منڈیر کے ساتھ جھکتے ہوئے کہا۔

"نہیں شکریہ۔"

"تو ناراض ہو گیا میرا سانوریا"

"مجھے ایسی باتیں پسند نہیں۔"

تمہیں بھلا کیا معلوم تھا کہ جب چاندنی اس طرح رقص کیا کرتی ہے تو جسم کے تاروں کا کیا حال ہوتا ہے۔ تم کیا جانو کہ پورے چاند کے دہکتے ہوئے الاؤ میں تتلیاں کس طرح جلتی ہیں۔

"ادھر آ جاؤ اس چھت پر۔"

" بہیا شریف آدمی دوسروں کی چھتوں پر نہیں جاتے "
" تو شریف بہیا فلا تمہارے لان میں آجائیں ؟ "
تم ہنس دیئے اور مجھے محسوس ہوا چاندنی کے دریا میں کسی نے ہلکا سا کنکر پھینک دیا تھا۔ لہریں ڈولنے لگی تھیں اور میں انہیں بنی ہوئی لہروں کا سہارا لئے چھت کی ریلنگ سے لان کے ہموار احاطے میں آ گئی
" میں اکیلا بور ہو رہا تھا "
" کہاں گیا تمہارا منگیتر ؟ "
" وہ آج کوئی پنجابی پکچر دیکھنے گیا ہے "
" تم تو بڑے بور ہو رہے ہیں "
" ایک سگریٹ پینے کو جی چاہ رہا تھا، وہ بھی ماچس نے دیا۔ خاک سے بور ہو رہے ہیں "
" لو میں سلگا دیتی ہوں سگریٹ "
میں نے تمہارے ہاتھ سے دیا سلائی کی ڈبیا لے کر دیا سلائی جلائی لیکن وہ فوراً ہی بجھ گئی۔
دوسری جلائی تو وہ جلی ہی نہیں۔
" اتنے روپے کماتے ہو ایک سگریٹ لائٹر نہیں خرید سکتے "
" تم بھی ایک اچھے خاصے افسر کی بیٹی ہو، تم ہی خرید دو "
" پھر میں خرید دوں گی "
" اچھا تو سگریٹ سلگا دو " تم نے یہ کہہ کر دیا سلائی کی ڈبیا میرے ہاتھ سے لی سگریٹ سلگایا اور ایک لمبا کش کھینچ کر سارا دھواں میری آنکھوں میں چھوڑ دیا۔

آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو مسلنے لگی اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میرا سر تمہارے کندھے پر تھا اور میرے کھلے ہوئے کالے بال تمہارے سینے پر لہرا رہے تھے۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے کافی پی رہے تھے میں نے خود بنائی تھی کافی تمہارے لئے۔ یہ جانتی ہوں کہ کڑوی کافی تمہاری کمزوری کا ہے اور اگر دودھ یا کھانڈ زیادہ ڈال دی جائے تو تمہیں غصہ آجاتا۔

"اتنی کڑوی کافی تم کیسے پیتے ہو؟"

"جیسے اب پی رہا ہوں" تم نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا اور سگریٹ کا بھر پور دھواں ایک بار پھر لہرا دیا۔

"لیکن تم کافی بہت پیارے انداز سے ساقی ہو!"

"سچ"

"ہاں"

اور مجھے محسوس ہوا کہ میری آدھی پیالی چھلک جائے گی اور اگر وہ بھری ہوئی ہوتی تو اب تک چھلک بھی چکی۔

اب تمہیں اتنے پیارے انداز سے بیا کر کون پلاتا ہوگا کافی؟ کوئی تو پلاتا ہی ہوگا۔ وہ جس کی خاطر تم نے دیوا دیلا لگ کر مجھے پیچھے کھڑا ہی جھوڑ دیا تھا اور میری نگاہیں آکاش میں تمہیں ڈھونڈتی رہی تھیں۔ وہ آج بھی ڈھونڈ رہی ہیں اور آج پھر پورنیما کی رات ہے لیکن میرے بال کھلے ہوئے نہیں ہیں اور میری آنکھوں میں وہ چمک نہیں اور چاندنی کی ٹھنڈک میری آنکھوں میں پڑ رہی۔ وہاں تو اب گرم راکھ اڑ رہی ہے صرف میں ہی اکیلی کٹے ہوئے پتنگوں کی طرح۔

اور پھر ایک دن سامان سے بھرا ہوا ٹرک تمہارے مکان کے سامنے
رکا مزدوروں نے سامان اندر رکھا۔ دن بھر کمرے ٹھیک ہوتے رہے
میں کئی بار چھت پر گئی۔ منڈیر کے ساتھ لگ کر جھانکا لیکن سوائے
ادھر اُدھر بکھری ہوئی چیزوں اور مزدوروں کے کچھ نظر آیا۔ مجھے اس
بات کی بڑی خوشی ہوئی کہ لان میں اُگے پودوں میں کوئی پانی تو ڈالا کرے
گا ورنہ اب تو وہ سوکھنے کی حد تک پہنچ چلے تھے۔ ٹھیک ہی ہے پھر
آگیا کوئی انہیں بچانے۔ اس دور جانے کیوں میں بے حد جذباتی ہو رہی تھی
ان کمروں میں کوئی اجنبی آدمی رہا کرے گا۔ جس کی دیواروں پر تمہارے نقوش
مرتسم تھے۔ ان کواڑوں کو کوئی اور کھولے گا جن پر تمہاری انگلیوں کی پوروں
کے لمس خوابیدہ تھے۔ اس غسل خانے میں نہایا کرے گا جس میں تمہارے
صابن اور پاؤڈر کی بھینی بھینی خوشبو اڑا کرتی تھی۔ لان کی اس گھاس کو کوئی
انجانا شخص روندا کرے گا۔ جس پر میرے اور تمہارے قدموں کے نشاں بڑے
سکوں سے سو رہے تھے کسی کے بے احتیاط پاؤں انہیں ان کو سپنوں سے
جگا دیں گے اور اگر یہ ایک بار جاگ گئے تو پھر کبھی نہ سو سکیں گے۔ میں یہی سوچتی
رہی دن بھر، بار بار جی چاہتا تھا ایک بار گیٹ کھول کر اندر چلی جاؤں
اور کوٹھی کی ہر ایک چیز کو پیار بھری نظروں سے دیکھ آؤں۔ اس کے بعد تو
ہر چیز کی ہیئت بدل جائے گی۔ اس کا روپ تبدیل ہو جائے گا۔ میں
اپنے قدموں کے سوئے ہوئے نشانوں کو اٹھا کر کسی گڑھے میں دفن کر
آؤں کہ وہ کسی ٹھوکر کا نشانہ نہ بن سکیں۔ ایک آدھ بار گئی بھی گیٹ تک
لیکن کئی لوگ کھڑے تھے واپس آگئی اور اپنے بستر پہ گر گئی روتی رہی۔
یہ تمام جانی پہچانی چیزیں۔ یہ سارا دیکھا بھالا ماحول، یہ دیوار اور در سبھی

کچھ اجنبی سے والے تھے اور تم ان سب کو میری تحویل میں چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔

شام کو ایک بار چھت پر گئی تو سامان کمروں میں رکھا جا چکا تھا اور ایک آدمی لان میں لگے ہوئے کھمبے کے ہولڈر میں بلب لگا رہا تھا بہت دنوں کے بعد آج وہاں روشنی ہوگی۔ ایک بار میں گیٹ تک گئی۔ وہاں نام کی ایک نئی تختی لگ رہی تھی۔ اس پر کا سی پی سی ایس۔

تو کوئی مجسٹریٹ آئے تھے تمہارے مکان میں۔ جانے کیوں مجھے قانون جاننے والے لوگ بڑے روکھے اور ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند نظر آتے ہیں۔ قانونی نقطے کو پرکھنے والے جذبات کی دھڑکنوں کو نہیں سمجھ سکتے تھے، تو اکبر اور جہانگیر کا انصاف مشہور ہے ایک منصف کبھی ایک اچھا محبت کرنے والا بھی ہو سکتا ہے اس کا مجھے یقین نہیں۔

مجھے اس بات سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ بلکہ افسوس ہوا کہ اب تنہائی کی کلیوں کی بات ادھوری رہ جائے گی۔ کوئی ان کی زبان کو نہ سمجھ سکے گا چاندنی کی سرگوشیاں گنگ ہو جائیں گی کیونکہ انہیں سننے کے لئے کسی کے پاس وقت نہ ہوگا۔ جہاں گیٹ پر شام کو سگریٹ کار، لیکھک کھڑے ہو کر تم سے کتنی کتنی دیر جاتے جاتے رک کر باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہاں اب پولیس کے سپاہی بندوقیں لگے ہوئے مجسٹریٹ کے ساتھ کھڑے ہوں گے رپورٹ لینے کے لئے نہیں مزید سلاخوں کے پیچھے بند کر سکنے کی اجازت چاہنے کی خاطر یہ کوئی خوبصورت تبدیلی نہیں تھی۔

دل اکیلا اداس ہو گیا تھا۔

رات میرے تاکھانے کی میز پر مال سے کچھ پوچھ رہے تھے۔

باتیں تھیں۔ سامنے دیوار پر لگی ذرتاسیرگل کی تصویر کی طرف کسی کی نگاہیں
نہیں اٹھیں۔ الماری میں رکھی ہوئی کتابوں کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔
مسل ہیں پر اونگھتے ہوئے ساسیال کے نئے گملے پر کسی کی نظر نہیں گئی۔
میں خواہ مخواہ کڑھتی رہی۔ سوچ رہی تھی تم نے میری سوچ کا ڈھنگ کتنا
غلط بنا دیا تھا۔ میں حقیقت پسند رہی تھی۔ ایک دم آئیڈیلسٹ بن گئی
تھی۔ میرے ایک خاص قسم کے نظریات بن گئے تھے جن پر بہت کم لوگ پورے
اترتے تھے۔ کبھی کبھی تو تم بھی اس سطح سے نیچے ہی رہ جاتے تھے پر تو تم نے
مجھ پر سب سے بڑا ظلم کیا تھا۔ مجھے اس دنیا کے انسانوں سے مختلف بنا کر
تم نے اچھا نہیں کیا تھا۔ میرے دوست لیکن اب تمہیں اپنا دوست کہہ سکنے
کا مجھے حق ہی کہاں ہے؟ دوستی کے جو اصول تم نے مجھے سکھائے تھے وہ تم نے خود
ہی توڑ دیئے۔ کاش تم نے دشمنی کے بھی کچھ اصول سکھائے ہوتے۔ تاکہ وہ نہ
ٹوٹتے! نہیں شاید تم نبھا بھی سکتے! لیکن اصول ہوتے بھی کہاں ہیں! وہ چاہے
دوستی کے ہوں چاہے دشمنی کے۔ تو بہتر ہے آدمی بے اصول رہے۔ چھوڑو میں کس
بحث میں الجھ گئی۔ سچ مانو میں پہلے ایسی نہیں تھی۔ تمہارے ساتھ کبھی بحث
نہیں کی تھی۔ تم جو کچھ کہتے تھے اسے مان لیا کرتی تھی۔ کبھی اس کی مخالفت نہیں
کرتی تھی۔ بحث کرنے کی عادت اب پڑی ہے مجھ میں۔ پل پل میں کچھ اٹھنا
اور لگاتار کھو دیا تو اب سیکھا ہے میں نے۔

کھانے کے بعد کافی کے پیالے کی بات سبھی نے پسند کی طبیعت نہ
کرتے ہوئے بھی میں نے بڑی محنت سے کافی بنائی اور پیالوں میں ڈال
کر سامنے رکھوائی۔

"بہت ہی کڑوی کافی ہے۔" آسی کونے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے مہمان نے کہا۔

تو شربت مجھوا دوں یہ میں پردے کے پیچھے کھڑی تھی کھینچ کر لائی
ایک زور کا قہقہہ بلند ہوا اور آسد پر گلاس کی کامی واقعی شربت
سی گئی۔

پتا جی کے ماتھے پر بل تھے اور دولہا کے ماتھے پر پسینے کے قطرے
ماتھے کے بل اور پسینے کے قطرے دونوں مل جاتیں تو لطف
آجاتا ہے" تمہارے ایک بار کے کہے ہوئے الفاظ کانوں میں گونج گئے۔ اور انہیں
کو دہراتے ہوئے پردے کے پیچھے سے ہٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی
اور دیر تک جانے کیا سوچتی رہی اور پھر سو گئی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ماں باپ
کھا گئی تھی اور اب مجھے بھوک پیٹ میں سونے کی کوشش کرتا تھا۔
یہ الفاظ تم نے جب کہے تھے۔ جب ایک دن تم نے میرے بازوؤں
میں جھکی بھر لی تھی۔ اور میرے ناراض ہونے پر ایک ایسی بات کہہ دی تھی جسے
سن کر میں لپٹ کر سو گئی تھی اور پھر تم نے مجھے گدگدایا تھا۔ اور تمہارے خیال
کے مطابق میرے ارد گرد تبسم کی پنکھڑیاں گرنے لگی تھیں۔ جیسے رات کے پچھلے
پہر پھولوں پر شبنم گرا کرتی ہے۔ لیکن اب تبسم کی پنکھڑیاں نہیں گرتیں اسی طرح
کے سوکھے ہوئے پتے میری تنہائی کی شاخوں سے ٹوٹ کر پھڑپھڑاتے رہتے
ہیں اور ان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا میں خود بھی نہیں۔ ایک دن ان
ان سوکھے ہوئے پتوں کا ڈھیر اتنا بڑا ہو جائے گا کہ مجھے آسانی سے
ڈھانپ سکے۔ تو میں انہیں اپنے ارد گرد اوڑھ کر ان میں دب جاؤں گی اپنی
آنکھیں کھلے پیلے آکاش پر گاڑ دوں گی اور انتظار کروں گی کہ کب پورنیما کا
چاند اپنی پوری تابانیوں سے جہان بھر کو منور کرتا ہے اور کون دمکتا چاند
میں ڈوب جائے گا تو میری تنہائی کی شاخوں سے ایک آخری پتہ گرے گا اور پھر

میں ان سارے ڈھیر میں آگ لگا دوں گی اور ہوا کے جھونکے گرم راکھ کو اڑا کر چاند
کے پھیلے ہوئے آنچل میں بھرتے جائیں گے۔

اس روز کے بعد آسد پرکاش ہمارے گھر نہیں آیا۔ کیونکہ وہ اکیلا تھا تمہاری
طرح اور اس کا ایک لڑکا ہے بالکل تمہارے منگیتر کی طرح۔ نام ہے چھانگا۔
شاید اس لئے کہ اس کے دائیں ہاتھ کی چھ انگلیاں ہیں۔ ایک انگلی نہیں بلکہ ایک
انگوٹھا فالتو ہے جو اصل انگوٹھے سے چھوٹا ہے اور اس کے ساتھ سانپ کی طرح
چمٹا رہتا ہے اور ایسا ہی بیکار جیسا کہ سایہ ہوتا ہے۔ وہ اکیلا تھا اس لیے اکثر وہ
انہیں افسروں سے ملتا جلتا تھا جو اکیلے تھے یا جن کی شادی کو زیادہ عرصہ
نہیں گزرا تھا۔ بڑی عمر کے لوگوں کے یہاں اس کا آنا جانا نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ
بات بھی مجھے چھانگے نے ہی بتائی تھی جو کبھی ہمارے گھر لونگ مرچ جیسی بے مصرف
چیز جو اکثر ختم ہو جاتی ہے لینے آ جاتا تھا۔

میں اکثر چھت کی منڈیر کے ساتھ لگ کر جھانکا کرتی لیکن آسد پرکاش تھوڑا
باہر کم رہتا تھا۔ رات کو دیر سے کلب سے واپس آتا کھانا کھاتا اور سو جاتا۔ لان
میں لگا لیمپ بھی کم ہی جلتا۔ جلتا بھی تو بس بے سود جلتا ہی رہتا کیونکہ لان میں
کبھی کوئی نہ بیٹھتا تھا۔ وہاں کوئی آرام کرسی نہ رکھی جاتی تھی۔ آلوچے کے پیڑ کے
کے قریب کوئی کافی نہ پیتا تھا۔ چاندنی رات میں گھاس پر کوئی نہ ٹہلتا تھا اور
ہماری چھت کی طرف کسی کی آنکھ نہ اٹھتی تھی۔ مجھے تو یہ احساس ہی نہ ہوتا تھا
کہ تمہارے والے مکان میں کوئی رہ بھی رہا تھا۔ لیموں کے پودوں میں پانی بھی اسی
وقت ڈالتا تھا جب وہ سوکھنے لگے ہوں۔ تم تھے تو ہر اتوار کو مالی آتا تھا
گھاس کو کاٹ کر ہموار کرتا تھا۔ پودوں میں صفائی کرتا تھا۔ آلوچے کے
پیڑ کو بڑے پیار سے سنوارتا تھا۔ اب تو یہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کبھی کسی شام

سے اگر تم سے شعر نہیں پڑھا کبھی کسی ستار نواز نے تار کو نہیں چھیڑا کہیں کوئی
ہنگامہ نہیں۔ ہلچل نہیں، حرکت نہیں۔ سب کچھ قانون سے بندھا ہوا ہے ایک
کسا ہوا کھیل کوئی ڈھیل کی گنجائش نہیں کئی بار جی چاہا کہ اس سارے نظام
میں ایک منتشر سی پیدا کر دوں کبھی گیٹ کھول کر باہر چلی جاؤں کبھی
پر ایک آدھ پلیٹ گرا کر شیشے کا کوئی گلاس توڑ کر
کسی دروازے کو زور سے بند کر کے اس سناٹے میں ارتعاش پیدا
کر دوں لیکن بس سوچا ہی۔ کیا کچھ بھی نہیں ——————
کر تو کچھ بھی نہیں سکتی اتنی اونچائی سے گری ہوں کہ سارا جسم چور چور ہو
گیا ہے۔ ایک دم اپاہج بن کر رہ گئی ہوں۔ صرف سوچتی ہوں کرتی کچھ نہیں صرف
رنگ گھولتی ہوں۔ برش پکڑتی ہوں تو ہاتھ لرزنے لگتے ہیں۔ اسی لئے ذہن میں
بے شمار خاکے ہونے کے باوجود ایک بھی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ خاکے خوبصورت
ہیں رنگ بھی بہت پیارے ہیں لیکن تصویر ایک بھی پوری نہیں۔ ایک دن
سب کچھ اٹھا کر کباڑ خانے میں پھینکنا پڑے گا۔ کبھی پرانی
چیزیں خریدنے کی دھن سوار ہو تو میرے پاس آ جانا بہت سستے میں مل
جائیں گی۔ انسانی زندگی کے اجڑے ہوئے نامکمل سپنے تمہیں سنک ہے
نایاب چیزیں خریدنے کی اور کھنڈروں میں گھومنے کی۔ کچھ برس بعد
اس طرف نکل آنا تمہاری یہ سنک پوری ہو جائے گی۔ ایسی توقع کے مطابق تمہاری
خدمت کروں گی۔ وعدہ رہا۔ یہ تمہارے وعدے نہیں جو تم نے چاند تاروں
کی قسم کھا کر کئے تھے یہ میرے وعدے ہیں جو میں دھرتی کی قسم اٹھا کر رہی
ہوں۔ دھرتی جس پر ہمارے پاؤں ٹکے ہوئے ہیں اور جو ہمیں زندگی دیتی ہے۔
چاند تاروں کی طرح صرف تصور نہیں۔

ارے میں پھر بحث میں الجھ گئی۔ بری عادت روز بروز مضبوط ہوتی
جا رہی ہے۔ اس کے لیے اب کہاں تک معافیاں مانگوں پھر ملوں!
اور پھر ایک رفتہ میں اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکی۔
اس دن صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ کھل کے برس جانے والی نہیں ہلکی
ہلکی گھٹ گھٹ کر برسنے والی جیسے کوئی نئی بیاہی سسرال میں سب کی نظر بچا کر
اور سانس روک کر تکیے میں منہ دیے رو لیتی ہے۔ ڈرتی ہے کہ کہیں کوئی دیکھ
نہ لے ایسے رونے سے دل کی بھڑاس نکلتی نہیں بلکہ اور بڑھتی ہے اور ایسی بارش
سے موسم کھلتا نہیں بلکہ امس اور بڑھتی ہے۔ آسمان صاف نہیں ہوتا اور زمین
اور بھٹ میلی ہو جاتی ہے۔ تمہارے جانے کے بعد یہ تین ہی کام رہ گئے
میرے لیے رٹ کرنا، پڑھنا اور سوچنا۔ جب رٹ کر کے تھک جاتی ہوں تو کچھ
پڑھنے لگتی ہوں اور جب پڑھ نہیں سکتی تو آنکھیں بند کیے لیٹ جاتی ہوں اور
سوچنے لگتی ہوں اور میں اکثر غلط رٹ کرتی ہوں، غلط ہی کسی قسم کی کتابیں
پڑھتی اور سوچتی تو سرے سے میں غلط ہوں اور جب تینوں غلط کام کر
کے اوب جاتی ہوں تو میرے من کی کیفیت اس گھٹا کی طرح ہو جاتی ہے جو کل شام
سے چھائی ہوئی تھی۔ نہ کھلتی تھی نہ برستی تھی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہی کرشن
کافی پی جو تم نے مجھے سکھا دی ہے۔ لیٹنے کو جی نہیں چاہا۔ ریڈیو کا سوئچ آن
کیا لیکن وہ درد بھاری لے طبیعت بہلانے نہیں لگا اور بھی الجھا دی۔ ہلکی سی
شال اوڑھے باہر نکل آئی۔ یہ نہیں سوچا تھا کہ قدم تمہارے مکان کے سامنے رک
جائیں گے اور آگے نہ بڑھ سکوں گی۔ اسد پھر کاشی لا کر جانے کا تانگا کہیں
جانے کی تیاری کر رہا تھا مجھے گیٹ پر کھڑا دیکھ کر آ گیا۔
"آئیے بی بی جی، آپ تو کبھی آتی ہی نہیں"

میں انکار نہیں کر سکی اور تمہارے جانے کے چار مہینے بعد تمہارے
مکان میں داخل ہوئی۔

"تم چار بجے تھے کہیں؟"

"دو بازار سے دو ایک چیزیں لانی ہیں۔ صاحب کھانا کھا کر کچہری
گئے ہیں سو چا لے آؤں"

"اچھا تو پھر کبھی آئیں گے، سوچا تھا دیکھتی تم نے گھر کیسے سنبھال رکھا ہے"

"آپ چلو بازار میں بس پانچ منٹ میں آیا، دروازے کھلے ہیں"
اس نے کہا۔

"اچھا لیکن جلدی لوٹنا، کہیں مجھے گھر کی رکھوالی نہ کرنی پڑے۔"

"بس گیا اور آیا بی بی جی!"

یہ کہہ کر جانے لگا اتنی جلدی سے باہر نکلا کہ گیٹ بھی ٹھیک طرح سے
بند نہ کر گیا۔ اسے بھی میں نے بند کیا۔

گیٹ بند کر کے کچھ لمحے وہیں کھڑی رہی۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے گیٹ کا
آہنی لمس میرے ہاتھوں کے لمس کو پہچانتا ہے۔ وہ جیسے ایک دم جاگ گیا تھا
یہاں گیٹ پر ہاتھ رکھے ہم کتنی دیر تک کھڑے رہا کرتے تھے۔ کبھی میرا
ہاتھ تمہارے ہاتھ پر ٹک جاتا تھا کبھی تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ پر اور پھر ہم
باتیں کرتے رہتے تھے۔ اور ہمارا دھیان اس وقت ٹوٹتا تھا جب ہمارے
گھر کے سامنے سے گزرنے والی سنسان سڑک پر کسی رکشا کی گھنٹی گونجتی
تھی جیسے رکشا والا محض تفریح کے طور پر بجا لیا تھا۔ کسی راہ گیر کو خبردار کرنے
کیلئے نہیں۔ اور پھر لمحہ بھر کے لئے میرا ہاتھ گیٹ پر جھک گیا جیسے میں اسے سلام
کر رہی ہوں۔ اس لئے کہ ایک روز جب یہ کھلا تھا تو میری زندگی کے آنگن میں

پیار سے دلے یاؤں قاسم رکھا تھا اور پھر ایک شام جب پید ہوا تو میری زندگی میں خزاں کا درانی بھرتا ہوا یہ کھلنڈرا اس سسان سڑک پر روپڑ کر بل دیا اور پیار جب روٹھتا ہے تو منا نہیں۔ پیار کرنے والے ایسی میں ساری ہوں تو منی جاتے ہیں۔ لیکن پیار جب ایک بار روٹھتا ہے تو پھر صلح صفائی نہیں ہوتی پیار سمجھوتے نہیں کرتا۔ یا تو مٹ جاتا ہے یا پھر بار کر مرجاتا ہے بیچ کا راستہ اختیار کرنا اس کی روایات کے منافی ہے۔

گیٹ سے برآمدے کی طرف بڑھتے والی روش میری لطر دائیں ہاتھ اگی بیلی کی بیل پر پڑی جس نے پورچ کو آدھا ڈھانک رکھا تھا۔ کیا کوٹ کر بہار آئی تھی۔ پھول بھی تھے۔ کلیاں بھی، خوشبو بھی تھی۔ رنگینی بھی۔ بارش کے ننھے چھوٹے قطرے پھولوں کی پنکھڑیوں پر بھی جمے ہوئے تھے۔ میرا جی تو لگتے ہی ترس پڑے۔

یہیں کھڑے ہوکر تو تم نے ایک بار پوچھا تھا۔

"تمہیں پھول پسند ہیں یا کلیاں؟"

"کلیاں"

"کیوں؟"

"کلیاں پرکھات ہیں، پھول دوپہر، ایک میں زندگی اوپر کی طرف بڑھتی ہے، دوسرے میں نیچے کی طرف ڈھلتی ہے"

"کیا بات کہی ہے تم نے!"

میرا یہ جواب سن کر تم نے میرا کندھا تھپتھپایا تھا اور میرے ہونٹوں پر سوئی سوئی کلیاں کھل کر پھول بن گئی تھیں۔

"غلط بانیں سوچا تمہیں نے تو سکھایا ہے۔"
"ہاں، لیکن مجھے افسوس نہیں۔ تمہیں افسوس ہے کیا؟"
"مگر نہیں۔ افسوس اور پچھتاوا انسان کو کمزور بناتا ہے۔"
میں نے جواب دیا تھا۔
میری بات کا جواب نہ دیتے ہوئے تم نے بیل سے کلیاں توڑی تھیں اور انہیں میرے بالوں میں سجا دیا تھا۔
"آج سے میں اپنے کوٹ میں پھول نہیں کلیاں لگایا کروں گا۔" اور مسکرا دیئے تھے اور میں نے دو پیاری پیاری سفید کلیاں شاخ سے توڑ کر تمہارے بٹن ہول میں لگا دی تھیں۔
اب جانے پھول لگاتے ہو یا کلیاں یا کچھ بھی نہیں کیا کہہ سکتی ہوں زندگی میں یا صبح ہے۔ یا دوپہر اور یا پھر سلگتی ہوئی اداس شام۔ میں شام بن کر سلگ رہی ہوں اور تم دوپہر بن کر چمک رہے ہو۔ چمکتے رہو سدا یہی میری آرزو ہے۔
اتنی بے شمار کلیاں ہیں اور کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جی چاہتا ہے ساری کلیاں توڑ کر جھولی میں بھر لوں۔ کیا ہوا اگر ریس بارش سے بھیگ رہی ہیں میرا آنچل بھی تو آنسوؤں سے کھارا ہو گیا ہے اب اس میں بھی تو ساون بھادوں کی جھڑیاں سو رہی ہیں لیکن کہاں رکھوں گی ان کلیوں کو رہنے دو۔ لیکن تال کے بیلوں سے الجھ کر تو کچھ پھول نیچے گر گئے ہیں وہ میں نے اٹھا لئے ہیں اور پھر چھوٹی چھوٹی تین سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آ گئی ہوں۔
اس کا لمبا برآمدے میں امرتا شیرگل کی وہ دو تصویریں ہوا کرتی تھیں جو اس میرے

ڈرائنگ روم میں ہیں میرے جسم دل پر تم نے دونوں تصویریں مجھے بھینٹ
کر دی تھیں۔ اور ان کی جگہ اور تصویریں لگا دی تھیں جیسے اب تم نے مجھے
اپنی زندگی کی دیوار سے اتار کر پھینک دیا ہے اور میری جگہ ایک اور
تصویر سجالی ہے اب یہ برآمدہ کیسا ویراں نظر آ رہا ہے یہیں ایک کونے میں تم
نے ایک کرسی ڈال رکھی تھی جہاں بیٹھ کر تم ویراں سڑک کو تکا کرتے تھے
یہیں ایک طرف تمہارا شو ریک تھا جس میں تمہارے جوتے رکھے ہوئے
تھے یہاں ہوا کرتا تھا تمہارا براؤن رنگ کا جوتا جس کی سطح پر ایک دن میں
نے پن سے اپنا نام لکھا تھا۔

"یہ کیا بچپنا ہے" تم نے کہا تھا اور اسے رومال سے مٹا دیا تھا مگر
نام تمہارے ہاتھ سے مٹا تھا۔

اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے۔ کیسی بچوں طفلی بات کی تھی میں نے اس
میں کیا تک تھی بھلا صرف اتنی کہ میں نے تمہیں دلیلہ وار دیا تھا

لیکن اس برآمدے میں تو اب کچھ بھی نہیں۔ کوئی تصویر نہیں، کوئی
رنگ نہیں۔ کوئی کرسی نہیں، کوئی ریک نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں صرف بلیڈ
کا ایک کور پڑا ہے، شاید جسے آنند پرکاش نے شیو کے وقت پھینکا ہوگا۔
یہ آنند پرکاش ستوا سا آدمی نظر آتا ہے۔ اسی لئے اس کی زندگی میں چنبیلی کی کلیاں
امرتا شیر گل کی تصویروں اور بیکار پڑی کرسیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں اس
کی زندگی میں شاید کہیں کوئی خلا نہیں۔

پھر وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی ہوں۔

ایک دم بدل گیا ہے یہ کمرہ پہچانا بھی نہیں جاتا یہ تو ایسے سوتے ہوئے
حالوں کو دیکھ دیکھ کر پہچان رہی ہوں جس الماری کے سامنے میں اور تم

کھڑے ہوکر کتابیں سجایا کرتے تھے اور ہر کتاب پر ہم دونوں کے نام لکھے ہوتے تھے۔ پہلے تمہارا پھر میرا۔ ان میں سے تو ایک بھی نہیں۔ پوری کتابیں ادھر ادھر کرنے لگی۔ سبھی ناولوں کی کتابیں تھیں یا کچھ سستے قسم کے انگریزی کے جاسوسی ناول۔ حسن پر پیگار کاٹنے کی کوشش میں آسد پر کاشن کا نام لکھا ہوا تھا۔ دوسرا کوئی نام نہیں تھا جسے دیکھ کر کسی نام کی ضرورت نہیں۔ شاید اس کا قانون اُسے ان فالتو بے کار باتوں کی اجازت نہیں دیتا۔

اسی کونے میں کھڑے ہوکر ہم تم دونوں نے پہلی کتاب پر نام لکھے تھے

"ریڈوا اسنایا سناۓ"

اور تاریخ ڈالی تھی چودہ اگست۔ میرے جنم دن کی تاریخ

چھت کے ہلکی رفتار سے چلتے ہوئے پنکھے کی ہوا سے گلدان میں رکھے پھول دھیرے دھیرے ہل رہے تھے اور میں انہیں کھڑکی کھڑی ایسے دیکھ رہی تھی۔ پھول کل دوپہر کے تھے جو صرف دوپہر تک ہی کھلتے ہیں اس کے بعد مرجھا جاتے ہیں۔

"میں ایک پھول توڑ لوں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں؟"

"اپنی آپا سا ستوری کرنے کے لیے۔"

"سمجھا نہیں"

"اس کے بعد یہ مرجھا جائیں گے۔"

اور میں نے تمہاری بات کا انتظار کئے بغیر گلدان سے دو پھول نکال کر تمہارے بالوں میں ڈال دیئے

تم نے مجھے دونوں بازو سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور میرا ماتھا چوم لیا۔

"کیوں ہوا تھا میری اَپاسنا کا آر مبھ۔
"ساتھ اکیلے پڑھا ہے تم نے؟"
"اس سے پراپتی کا احساس ہوتا ہے جو ہورٹ چہرے سے ملتی ہوتا ہے"
تم نے جواب دیا۔
"تو دیوانہ اپاسنا شبہ تھی؟"
"نہیں"
دونوں میری آنکھوں میں سوالیہ نشان چمک رہا تھا۔
"اپاسنا کا درشن ادھورا ہے"
تم نے پکڑ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور میں دیر تک ہنستی رہی
جب یہی جانتی تھی کہ میری ہنسی تو کسی دیوی کی ہنسی تھی جو سورج ڈھلتے
ہی مرجھا جاتی ہے اور کبھی ہواؤں کے ہونٹوں پر رقص نہیں کرتی۔

بھی
میری آنکھوں میں آنسو کیوں آگئے۔ میں بہت کمزور ہو گئی ہوں جب
آنسو آنے چاہیئے تھے جب تو ایک بوند نہیں نکلی۔ جیسے میری آنکھیں صحرا
جیسی ہوں۔ رو رو کر مجھے اس وقت چاہیئے تھا جب تم نے مجھ سے منہ پھیر
لیا تھا جب تو پتھر کا مجسمہ بن گئی تھی۔ جیسے بالکل بے حال اور بے حس ہوں
آج رو رہی ہوں اسد پرکاش کے کمرے میں جہاں میں چوری چھپے آئی ہوں
یہ بری بات ہے۔

ڈرائنگ روم میں رکھے فرنیچر کی ساری ترتیب بگاڑ ڈالی ہے ان
لوگوں نے فرنیچر اچھا ہے۔ لیکن رکھا ہوا کتنے غلط ڈھنگ سے ہے تپائی
پر رکھی سونی ایش ٹرے ادھ جلے سگریٹ کے ٹکڑوں سے اٹی پڑی ہے۔

کسی کو احساس ہی نہیں اس کا۔ اللہ تم کتنے بارک مزاج تھے۔ لیکن ایش تم سے کہاں صاف کرتے تھے تم بھی او وہ تو میں ہی آؤں اور اسے صاف کر کے اور پونچھ کے تپائی پر رکھوں ورنہ تم کٹہ ھتے مرور ہو گئے لیکن خود اس کو صاف نہیں کرو گے تمہاری کچھ عادتیں تو واقعی لڑکی جیسی تھیں دیکھو میری بات مانو۔ اب اپنے آپ کو سدھار لو اب تم گھر بار والے ہو۔ میری طرح اکیلے نہیں عورتیں لڑکی حساس ہوتی ہیں بہت جلدی اکڑ جاتی ہیں اپی ماں نہیں کر رہی میں تو تمہارا۔ صید چھوڑ کر میں حرکت کرنے لگی میں نے شال اتار کر ایک طرف رکھی اور اپنے میں ہمت سہ ہوتے ہوئے بھی کمرے میں رکھے تمام فرنیچر کی ترتیب بدل ڈالی۔ اب یہ کمرہ واقعی تنہا اکڑ دکھتا ہے۔ اب جاکر کہیں پہچان پائی ہوں۔ یہ آستد پر کاش تو بڑا سوتا ہے۔ ڈرامے سٹریٹ سا پھرتا ہے۔

پر دہ اٹھا کر دوسری طرف نکلی گئی سامنے لان تھا جس میں ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی سامنے کا وہ چھوٹا سا پیڑ آج بھی اسی شان سے کھڑا رہا تھا جب یہ کتنا چھوٹا تھا اب کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ بڑا مرد ہو گیا ہے لیکن بدلا نہیں۔ ایک دم پہچانا جاتا ہے اکثر چیزیں تو بڑا ہوتے بدل جاتی ہیں اس طرح بدلتی ہیں کہ ان کا اصلی روپ پہچانا ہی نہیں جاتا لوگ تو بیشتر ایسے ہی ہوتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو کبھی نہیں بدلتے۔ ان کے سبھاؤ میں کوئی ہیر پھیر کا ورتن نہیں ہوتا ان کے نظریات، احساسات، ان کے جذبے ویسے ہی رہتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے گھر میں اجنبی بن جاتے ہیں اپنے شہر میں پردیسی ہو جاتے ہیں اور اپنے وطن میں بے وطن ہو کر رہتے ہیں۔

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ٹیرس میں سے بالکنی میں آگئی ہوں ہائے
گھاس کتنی اونچی ہو گئی ہے۔ کیاریوں میں خشکی پودے زیادہ ہیں اور پھول
کم۔ رات کی رانی کی پتیاں کتنی پیلی ہو گئی ہیں لیکن آلوچے کا پیڑ
ابھی زندہ ہے۔ یہ میری محبت کا گواہ ہے۔ اسے میرے درد کا احساس
ہے۔ میں جب کبھی چھت پر اداس اداس نڈھال کھویا کرتی ہوں تو یہ اپنی
بانہیں پھیلا کر مجھے ڈھارس دیا کرتا ہے۔ میں چلتے چلتے اس کے پاس پہنچی
اس کا تنا تو میرے بازوؤں سے بھی موٹا ہے۔ مجھے ہنسی آگئی۔ کبھی زور کا جھکڑ
آیا تو یہ جڑوں سمیت زمین پہ آ رہے گا لیکن ریلیں پر تو وہ گرتے ہیں جو
زیادہ وزنی ہوں، جن کے دماغوں پر دنیا بھر کا بوجھ لدا ہو۔ جیسے کچھ نہیں
کچھ بھی نہیں۔ میں نے پیڑ کے تنے کو اپنے سینے سے لگا لیا اداسی کی سطح
پہ ہاتھ پھیرنے لگی ہوں اداسی کی پتیوں سے پانی کی بوندیں میرے بالوں
اور میرے گالوں پر گر رہی ہیں۔ جیسے وہ رو رہا ہے۔ اسے یہ غم ہو کہ تمہارے
ساتھ ساتھ میں بھی اسے چھوڑ گئی ہوں۔

۔ میں نے تمہیں چھوڑا نہیں بلکہ اپنی زندگی کا ایک ضروری حصہ بنایا ہے
اب تم میری شخصیت میں جذب ہو چکے ہو اب تم میرے تصور کی طرح
میرے ہو۔ اے میرے خوب صورت آلوچے کے پیڑ تم جو میری محبت کے
گواہ اور میرے درد کے ساکشی ہو!!

میں نے اپنی گیلی شال سے آنکھیں پونچھ لی ہیں اور واپس کمرے میں
آگئی ہوں۔ اس کمرے میں جہاں انتہا کی کاوش سجتا ہے۔ دیوار کے ساتھ پلنگ
لگا ہے۔ لیکن پھر غلط جگہ پہ جا لگے۔ غلط جگہیں کیوں چنتے ہیں ٹھیک
انتخاب کیوں نہیں کر سکتے۔ اور میں مسکرا دی۔ میں نے اب تک کوئی

ٹھیک جگہیں چنی ہیں اور صحیح استعمال کئے ہیں۔ تھک گئی تھی۔ ڈریسنگ اسٹول پر بیٹھ گئی لیکن آئینے کی طرف پیٹھ کر کے۔ آئینہ دیکھنے کی عادت بھی کوئی اچھی نہیں ہوتی انسان کو اپنے بارے میں غلط اندازے ہونے لگتے ہیں تھوڑی دیر بیٹھ کر صرف شال اتار کر ایک طرف رکھی اور پلنگ کو دوسری دیوار کے ساتھ کر دیا۔ کھڑکی کے ساتھ ٹھیک اس جگہ جہاں تمہارا پلنگ ہوا کرتا تھا کہ صبح سورج کی پہلی کرنیں کمرے کے اندر داخل ہو سکیں۔ کمرے کی دوسری چیزوں کو بھی ڈھنگ سے لگا دیا ہے۔ کونے میں پڑا ہوا شو ریک ایک طرف کرنے لگی تو اس پر کاسٹ کا بنا ڈان شو نیچے گر گیا اٹھانے لگی تو ہاتھ کانپ گئے۔ یہ تمہارے جوتے ہیں میں ایسا کچھ کر سکتی ہے کہیں جھاڑ پونچھ کر قرینے سے رکھ سکتی ہے۔ محترالتنے بھاری سے رہے۔ میں نے سیدھے مس نہیں کیے۔

اب تو پوری طرح تھک گئی تھی۔

پلنگ ہی پر بیٹھ گئی۔

یہ جیا لگا ابھی تک نہیں آیا تھا اب تو گھنٹہ بھر سے اوپر ہو گیا تھا آس پاس کی کوٹھیوں کے سبھی نوکر اکٹھے ہو گئے ہوں گے اور اسی لوئین سیاست پر بولی گے نہ لوعینہ بھی کیا جھگڑے ہیں اگر کبھی کوئی لونیں نہیں بنے گی تو وہ ان لوگوں کی بے جان کے ہاتھوں اجڑے ہیں اور زندگی نے جنہیں صرف درد دیا ہے۔ یہ بیچارے اپنے اپنے انفرادی غم لئے مرتے رہیں گے اور کبھی اکٹھے نہ ہوں گے بس اس لئے کہ ہر درد دوسرے درد سے مختلف ہوتا ہے مرہم دوسرے زخم سے الگ اور ہر آنسو کسی اور آنسو سے میل نہیں کھاتا اب یہ کمرہ تمہارا کمرہ بن گیا ہے۔ میں نے ڈرائنگ روم سے ایک

کتاب اٹھا کر اسے آدھا کھولا اور پلنگ پر سرہانے کے قریب الٹا رکھ دیا تپائی پر رکھے ٹیبل لیمپ کو جلا دیا۔ کمرے میں لرزتی پیاری سی روشنی پھیل گئی۔ مجھے آج ایک مدت کے بعد محسوس ہوا کہ تم میرے پاس ہو، دور نہیں تم نے مجھے چھوڑا نہیں بلکہ پہلو سے قریب ہو میں کہنیوں کے بل ذرا جھکی۔ تکیے کو ذرا قریب کھسکا کر تھکے ہوئے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا وہ اور ڈھیلا پڑتا گیا اور میں نیند آنکھوں کے دریچوں سے اپنے ماضی کی راہ گزاروں کو دیکھتی رہی اور پھر جانے کب میرا سر بھی تکیے پر ٹک گیا اور میں سو گئی مجھے معلوم نہیں تھا کہ کب آیا۔ اس نے مجھے جگایا نہیں۔ میں سوتی رہی۔

اور جب میری آنکھ کھلی تو میں گھبرا اٹھی۔

آنند پرکاش ڈرائنگ ٹیبل پر بیٹھا، ٹیبل لیمپ کی روشنی میں وہی ادھ کھلی کتاب جو میں نے تکیے کے قریب رکھی تھی پڑھ رہا تھا میری عجیب حالت تھی سخت ندامت کا احساس ہو رہا تھا۔ جلدی سے اٹھنے لگی تو آنند پرکاش مسکرا دیا۔ اس نے وہی ہلکے رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا جو وہ ہمارے گھر پہن کر آیا تھا حالانکہ ٹائی بھی وہی تھی۔

"میں بے حد شرمندہ ہوں" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا اور پلنگ کے پاس پڑی ہوائی چپل کو جھک کر دیکھنے لگی۔

"بہت بیمار ہو مجھے ہونا چاہیئے، جسے گھر میں چیزیں رکھنے کا بھی شعور نہیں۔ آپ نے بہت بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔ اب تو یہ گھر واقعی گھر لگنے لگا ہے؟" وہ بولا۔

"مجھے یوں چوری چھپے نہیں آنا چاہیئے۔"

"زندگی کے بہت سے اچھے لمحے سادگی میں چوری چھپے ہی آتے ہیں۔"

میں خاموش رہی۔

جیانگا چائے لے آیا تھا۔

"میں چائے نہیں پیوں گی۔"

"آپ تو کافی پیتی ہیں، میں بھول گیا۔"

"میرا مطلب ہے"

"کافی بھی ہو گی شربت نہیں"

اسد پرکاش نے پوٹ کی تھی۔ لیکن اچھے ڈھنگ سے اس خیال سے کہ کسی میں وقت ضائع ہو گا۔ میں نے کہا۔

"نہیں چائے ہی ٹھیک ہے۔"

اس نے چائے بنائی اور میری پیالی میں شکر اور دودھ ڈالنے کے بجائے ہی ڈالے۔ اپنی پیالی میں اچھا خاصا شربت سا تیار کرلیا۔

"گرگھاٹی والے! ان دنوں آجاتی تو ضرور ڈانٹتی آپ نے کمروں میں یہ تبدیلیاں کر کے مجھے ایک بہت بڑی ذہنی پریشانی سے بچا لیا ہے۔"

پوچھنا چاہتی تھی کہ یادرا کون ہے۔ لیکن بات بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ اور میں اب بات بڑھانے کے خلاف ہوں۔ اپنی مختصر سی بات کہہ کر جان چھڑا لیا کرتی ہوں۔ بات بڑھنے سے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے کچھ نہیں پوچھا۔ جلدی سے چائے پی اور گھر جانے کی اجازت چاہی۔

"پھر کب آئیے گا؟"

"جب اندر آتی آئیں گی۔" میں نے کہا اور پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔ وہ گیٹ تک میرے ساتھ آیا۔

اور پھر ایک اتوار اندرا بھی آ گئی وہ بھی کہیں مجسٹریٹ تھی۔ دونوں
ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے۔ کہیں اکٹھے رہ چکے تھے۔

یہ تو مجھے اس وقت معلوم ہوا جب جہانگیر کڑاہی لینے آیا تھا شاید
پکوڑے وغیرہ تلنے تھے۔ اس نے بتایا کہ جس لڑکی سے صاحب کی شادی ہونے
والی تھی وہ آئی ہوئی تھی۔ وہ صبح کی گاڑی سے آئی تھی اور اب رات کی گاڑی
سے واپس جا رہی تھی۔ جہانگیر کے کہنے کے مطابق وہ دونوں الگ الگ
بیٹھے کتابیں الٹتے پلٹتے رہے تھے۔ اکثر خاموش ہی رہتے تھے۔ کچھ
باتیں ہوئی تھیں لیکن ایسے جیسے دو اجنبی کہیں اچانک مل جائیں اسٹیشن
کے کسی ویٹنگ روم میں کسی ٹرین کے انتظار میں۔

اور پھر اندرا رات کی گاڑی سے چلی گئی۔ اور آسدپرکاش کو اسٹیشن
تک بھی ساتھ نہ لے گئی۔ یہ بات بڑی عجیب اور ناقابل اعتبار تھی۔ لیکن
ہوا ایسا ہی تھا۔

اور پھر ایک دن جہانگیر نے بتایا کہ جس کی لڑکی سے اس کے صاحب
کی شادی ہونے والی تھی۔ اس نے انکار کر دیا۔ دو قانون کے ماہروں نے ملاقات
کی اہمیت کو نظر انداز کر کے اپنی حقیقت پسندی کا ثبوت دیا تھا۔ اور
پرکاش بیمار تھا اور گہری لہروں میں جا رہا تھا۔ تب اس کی ماں پیسی کر کر کے
گئے اور اسکا ستارہ اپنے جیسے دورے پر چلے گئے تھے۔

جانے کیسے میں کس شام پھر تمہارے گھر چلی گئی۔ آسدپرکاش نڈھال
پڑا ہوا تھا۔ اور بستر میں ہی بیٹھا بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا۔
کمرے میں سگریٹ کے ان گنت ٹکڑے پڑے تھے
"آپ نے بڑی مہربانی کی جو آپ آ گئیں۔"

لگے تھے ہم سے بات بھی ٹھیک طرح سے نہ ہو سکتی تھی۔ مسکو مجھے بلا کر لایا تھا
"یہ کیا کر لیا تم نے؟" میں نے آتے ہی پوچھا
"ایک مستقل درد سے چھٹکارا پایا ہے" یہ ٹیبل لیمپ کی روشنی تمہارے
سوتے ہوئے چہرے پر پھیل رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے تم نہیں
بول رہے تھے بلکہ ایک سب ہارا جسم بول رہا تھا۔ میرے جسم میں ایک
کپکپی سی پھیل گئی۔
"یوں ہی پایا کرتے ہیں درد سے چھٹکارا؟"
"عام طور سے نہیں، خاص حالتوں میں" تم مسکرا رہے تھے جیسے
سیکڑوں زخم مسکرا اٹھے ہوں۔ میں نے ڈر کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ
لیے۔
"جی ہاں" میں نے کہا۔
"حقیقت سے آنکھیں موڑتی ہو؟"
حالانکہ سب سے زیادہ فرار کا جذبہ تم میں ہے۔ تم سمجھتے ہو
کہ مشکلات کا صحیح حل ان سے دامن بچانا ہے۔ کبھی تم نے کسی کا بھی سامنا
کا مقابلہ کیا ہے ہمیشہ بچنے کی ہی کوشش کی۔ تمہیں اب اپنی یہ عادت بدل
ڈالو۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔
میں خاموش رہی۔ آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا تم ابھی مسکرا رہے
تھے۔
ڈاکٹر آگیا تھا تمہیں دیکھنے۔ تمہارے بلانے پر نہیں۔ خود ہی اسی
غرض سے۔ تم تو شاید اسے کبھی نہ بلاتے۔
"معلوم ہوتا ہے آپ کو [illegible] نہیں کرتی۔

"ہاں ڈاکٹر"

"تو آپ نے بتایا کیوں نہ تھا؟"

"وہ دراصل لیا جا رہا تھا" تم پھر مسکرائے تھے اور میں کچھ عجیب سی ہو گئی سی، پھر کہا جانے یہ بات تھی کہ ڈاکٹر نے مخاطب کیا۔

"آپ جانتی نہیں تو"

"لیکن یہ کسی سے صلاح مشورہ تھوڑی ہی کرتا ہے۔ جو جی میں آئے کر بیٹھتا ہے؟"

میری اس بے تکلفی سے ڈاکٹر کو شاید الجھن ہو گئی

"آپ؟"

"ایسا"

ڈاکٹر کا ذہن الجھ گیا۔ اس نے اور سوال نہیں کیا۔ بیچارہ ڈاکٹر! ڈاکٹروں کے اپنے قانون ہیں۔ وہ بھی جذبات سے میل نہیں کھاتے اور جب ڈاکٹر تمہیں دوسری قسم کی دوائیاں دے کر چلا گیا تو تم نے پکارا۔

"ارے تم باہر چلی گئی ہو۔ اندر آؤ!"

میں اندر آ گئی۔

"کافی اور بھی پلاؤ تھی۔ تم تماشہ دیکھ رہی ہو؟"

منگیتو کافی کا سامان رکھ رہا تھا تو تم اخبار کے صفحے پہ نظریں گاڑیں لیٹے تھے اور میں تمہاری طرف دیکھ رہی تھی۔

"کچھ کھایا ہے انہوں نے؟"

"جی نہیں" منگیتو نے جواب دیا تھا۔

"شادی کی تاریخ طے ہوگئی؟" میں نے دوسری چوٹ کی۔
بڑا چالاک سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔ دوسرے جیسے بالکل ڈھولک پر تھاپ پڑی ہو، وہ ایسا ہی تلملا سے۔

"نہیں"

"کیوں"

"اس نے شادی سے انکار کر دیا ہے"
یہ بات کہتے ہوئے اسد کے چہرے کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا۔ اس کی آنکھیں چھلک آئیں اور مجھے لگا جیسے کانچ کی پیالی لرزنے لگی تھی۔

مجھے اس پر ترس آ گیا۔ ناحق میں نے بیچارے کو رلا دیا۔

"کارن؟"

"میں اس کے معیار پر پورا نہیں اترا"

"لیکن میں سمجھا تھا کہ آپ ایک دوسرے کو کئی برسوں سے جانتے ہیں"

"یہ ٹھیک ہے لیکن ایک دوسرے کو جاننے سے اپنے اپنے معیار نہیں بدل جاتے۔ مزاج نہیں تبدیل ہو جاتے، زندگی کی قدریں نہیں الٹ جاتیں۔"

"ہوں"

میں اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں نے اسے چاہا تھا اور سوچا تھا یہ چاہت اور میرا پیار شاید اس کے سنسکاروں کو بدل دے گا لیکن میں نے غلط سوچا تھا میں ہمیشہ ہی غلط سوچتا ہوں۔"

"ہوں"

میں اسے زر سہمے کا جائزہ کھو رہی تھی۔

"اس کی نظریں آکاش کے تاروں پر ہیں، دھرتی کے ذروں پر نہیں
وہ ایسی سپاٹوں میں مطمئن نہیں رہ سکتی۔ وہ پنکھ لگا کر اڑنا چاہتی ہے
اور میرے پنکھ کٹ چکے ہیں۔"

"پھر آپ نے خط میں لے ویسے ہی کہہ دیا۔ کہا کچھ بھی نہیں چاہتی تھی
صرف سوچنا چاہتی تھی اور اسے اور سمجھنا۔

"مجھے اپنی بیوہ ماں اور جوان بہن کی ذمہ داریاں ہیں۔ وہ ایک
امیر ماں، باپ کی اکلوتی لڑکی ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ ان لوگوں کو مجھ
سے کتنی امیدیں وابستہ ہیں، اسے معلوم نہیں کہ میری پڑھائی میں ماں
کے تمام زیور بک چکے ہیں۔ اور جب میں نے یہ سب باتیں بتانے کی
کوشش کی تھی تو وہ تنک اٹھی تھی اور کہا تھا کہ اسے ان سب باتوں سے
کوئی دلچسپی نہیں۔"

"اور کیا کہا تھا اس نے؟"

"اور کہا تھا کہ محبت ملک ([illegible]) تھی اور وہی طور پر میں۔
ایک جگہ رک گیا تھا۔"

"اور؟"

"اور یہ کہ شادی کے بعد میری ماں اور میری بہن میرے پاس نہیں
رہیں گی۔"

"کہاں رہیں گی؟"

"کہیں بھی،"

"لیکن میرے پاس نہیں۔"

اُس نے مجھے گیٹ کے باہر اپنے گھر کی طرف مڑتے دیکھا، اس میں کچھ تھا
جو میں سمجھ نہیں پائی۔

اور اب اپنے بستر پر پڑی، ادھ کھلی کتاب کو سینے پر رکھے پھر
غلط قسم کی باتیں سوچ رہی ہوں۔ مقابلہ کر رہی ہوں اپنا اور آنند پرکاش
کا۔ مجھے تم چھوڑ گئے اس لئے کہ میں تمہارے معیار پر پوری نہ اتر سکی اور آنند
پرکاش کو چھوڑ گئی کہ وہ اس کی حاملہ بیوی، ماں اور جوان بہن کا ہاتھ
نہ جھٹک سکا۔ ہم دونوں کی حالت ایک سی ہے۔ ہم دونوں کا درد ایک
ہے۔ صرف نوعیت مختلف ہے۔ کوئی ایک قانون ہے۔ جو ہم سب کو باندھے
ہوئے ہے۔ ہم میں سے شاید کوئی آزاد اور مختار نہیں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں اسے بچا رہی ہوں اور میرے
سینے پر کھلی کتاب نیچے بستر پر لڑھک رہی ہے۔ لڑھک جائے کب
تک سنبھالتی رہوں گی اسے؟

آخر کب تک؟

اور پورے چاند کی کرنیں کھڑکی سے داخل ہو کر مجھے گھور رہی
ہیں۔